# اکرام الباری

## شرح الحدیثین للبخاری

بخاری شریف کی پہلی اور آخری حدیث کا درس


افادات

محدث عصر حضرت علامہ اکرام علی صاحبؒ

سابق شیخ الحدیث جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل

نظر ثانی

حضرت مولانا محمد انصار صاحب دامت برکاتہم

شیخ الحدیث دار العلوم حیدر آباد

مرتب

مفتی عمار احمد قاسمی

استاذ دار العلوم حیدر آباد

# اکرام الباری
# شرح الحدیثین للبخاری

## بخاری شریف کی پہلی اور آخری حدیث کا درس

افادات

محدث عصر حضرت علامہ اکرام علی صاحبؒ
سابق شیخ الحدیث جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل

نظر ثانی

حضرت مولانا محمد انصار صاحب دامت برکاتہم
شیخ الحدیث دار العلوم حیدر آباد

مرتب

مفتی عمار احمد قاسمی
استاذ دار العلوم حیدر آباد

ناشر: جامعہ اسلامیہ دار العلوم حیدر آباد

| | |
|---|---|
| نام کتاب | اکرام الباری شرح الحدیثین للبخاری |
| افادات | محدث عصر حضرت علامہ اکرام علی صاحبؒ<br>(سابق شیخ الحدیث جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل) |
| نظر ثانی | حضرت مولانا محمد انصار صاحب (شیخ الحدیث دارالعلوم حیدرآباد) |
| مرتب | مفتی عمار احمد قاسمی |
| سنِ اشاعت | ۱۴۳۹ھ - ۲۰۱۸ء |
| تعدادِ صفحات | ۷۲ |
| کمپوزنگ | مولانا سعد عالم ندوی |
| تصحیح وسیٹنگ | محمد بُشیر معروفی قاسمی (دارالعلوم حیدرآباد) |
| قیمت | ۵۰ روپے |
| ناشر | جامعہ اِسلامیہ دارالعلوم حیدرآباد |
| ای میل | amqasmi1991@gmail.com |

## ملنے کا پتہ

محمد عمار احمد (دارالعلوم حیدرآباد) موبائل: 8019977164

# فہرست عناوین

# تقریظ

## محدث جلیل استاذ العلماء نمونۂ اسلاف تلمیذِ شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد انصار صاحب

شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ دارالعلوم حیدرآباد

برادر گرامی قدر حضرت مولانا محمد اکرام علی صاحب قدس سرہ سابق شیخ الحدیث جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل گجرات کا درسِ حدیث اس قدر جامع، مرتب اور عام فہم ہوتا تھا کہ اعلیٰ اور کمزور صلاحیت کے طلبہ ان کی تقریر سے پورے طور پر استفادہ کرتے تھے، یوں تو ان کی درسی اور عوامی ہر تقریر ایسی مرتب اور مربوط ہوتی تھی کہ عوام وخواص پورے طور پر استفادہ کرتے تھے، جملہ سامعین پر محویت کا عالم طاری ہوجاتا تھا، تقریر ختم ہونے سے پہلے درمیان میں اٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں تھا، سچ تو یہ ہے کہ ان کی تقریر سننے سے تعلق رکھتی ہے اس کو بیان کرنا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ ع ذوق ایں مے نمی دانی بخدا تانہ چشی

ان کے تلامذہ کا عام تأثر یہ تھا کہ ہر سال ختم بخاری کی تقریر بالکل نئی اور انوکھی ہوتی تھی، عنوان بھی بالکل نیا ہوتا تھا، اسی جدت کی وجہ سے کبھی دورانِ تقریر اکتاہٹ نہیں ہوتی تھی۔

؎ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

اسی وجہ سے میرے عزیز مولانا مفتی عمار سلمہ بڑی محنت اور لگن سے بخاری شریف کی پہلی اور آخری حدیث کی جامع تشریح کا مجموعہ آپ کے سامنے پیش کررہے ہیں، اللہ کی رحمت سے بعید نہیں کہ وہ اس آغاز کو بخاری شریف کی بقیہ تقریر کی اشاعت کا ذریعہ بنادے، **وما ذلك على الله بعزيز.**

عزیز موصوف کی تالیفی یہ پہلی کوشش ہے، اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرما کر اس کا فائدہ عام اور تام بنادے، آمین اور ان کے اندر تحریر کی پختگی اور تصنیف وتالیف کا صحیح سلیقہ پیدا ہوجائے۔

ایں دعا از من واز جملہ جہان آمین باد

محمد انصار غفرلہ

خادم جامعہ اسلامیہ دارالعلوم حیدرآباد

# توصیفی کلمات

## مخلص کرم فرما گرامی قدر مفتی امداد الحق بختیار صاحب

استاذ حدیث وصدر شعبۂ عربی ورئیس التحریر مجلّہ ''الصحوۃ الاسلامیہ'' دار العلوم حیدر آباد

**الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد الأنبياء والمرسلين، وعلى آله وصحبه أجمعين، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين، أشهد أن لا إله إلا الله، وأشهد أن محمدا عبده ورسوله، وبعد.**

بخاری شریف، جسے قرآن کریم کے بعد صحیح ترین کتاب ہونے کا درجہ حاصل ہے؛ امام بخاریؒ نے کتاب میں احادیث کے انتخاب اور ترتیب میں جس معیار کو اختیار کیا ہے، وہ امیر المؤمنین فی الحدیث ہی کا حصہ ہے، اسی کے ساتھ تراجم بخاری میں آپ نے جن علوم ومعارف کا خزانہ ودیعت رکھا ہے، وہ فقہ واستنباط اور علوم حدیث میں کسی کرشمہ اور کرامت سے کم نہیں اور جس طرح بخاری کو ''اصح الکتب بعد کتاب اللہ'' ہونے کا شرف ومقام حاصل ہے، اسی طرح قرآن کریم کے بعد سب سے مخدوم کتاب بھی یہی ہے، ہر زمانہ میں علماء اور محدثین نے اس کتاب کی مختلف اور حیرت انگیز خدمات انجام دی ہیں۔

حضرت مولانا علامہ محدث اکرام علی رحمہ اللہ (سابق شیخ الحدیث جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل، گجرات) مسلمہ طور پر ملک کے چنیدہ محدثین اور مقبول وماہر اساتذہ حدیث میں سے ایک تھے، ایک لمبے عرصے تک حدیث اور علوم حدیث؛ بالخصوص بخاری شریف کے ساتھ آپ کی مزاولت رہی ہے، آپ کے دروس وافاداتِ حدیث کو پڑھ کر اور درسی تقریروں کو سن کر آپ کے تبحر علمی، وسعت مطالعہ، ذوق تحقیق اور انوکھے اسلوب تدریس کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک سمندر ہے جو اپنی گہرائی اور وسعت کے

باوجود انتہائی سنجیدگی، متانت اور پورے اطمینان کے ساتھ پیہم جاری وساری ہے، آپ کے سبق کی ایک اہم خصوصیت، جس کا کچھ اندازہ اس طالب علم کو بھی ہوا، وہ یہ ہے کہ اِن دروس سے اجتہادی کیفیت اور مجتہدانہ بصیرت کی روشنی پھوٹتی ہے؛ تقلیدی طرز اور مانگے کے چراغ جیسے عیوب سے یہ اسباق بالکل دُھلے ہوئے ہیں۔

مولانا ومفتی عمار قاسمی صاحب، **عمّره الله تعالى**، ہمارے رفیق اور چمن عاقل: جامعہ اسلامیہ دارالعلوم حیدرآباد کے ایک فعال اور ذی استعداد استاد ہیں، درس و تدریس کے ساتھ ساتھ لکھنے کا بھی اچھا ذوق رکھتے ہیں، ملک کے بہت سے مجلّات اور اخبارات میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں اور داد تحسین بھی قبول کرتے ہیں، آپ نے بڑی کاوش کے ساتھ حضرت مولانا اکرام علیؒ کے دروسِ بخاری کی آڈیوز حاصل کیں اور پھر انتہائی عرق ریزی اور شبانہ روز کی محنت ومشقت کے بعد بخاری شریف کی پہلی اور آخری حدیث کے درس کو سپرد قرطاس کرکے، تسوید وتبییض اور تہذیب وترتیب کے مشکل ترین مراحل سے گزارا اور اس طرح یہ قیمتی اور گراں قدر سوغات ہماری خدمت میں پیش کی ہے، اس کام کی نزاکت اور دشواری کا کچھ اندازہ، ان حضرات کو ہوگا، جن کا قلم وقرطاس کی اِس سیاہ وسفید وادی سے کبھی گزر رہا ہو۔

نیز مفتی صاحب نے جہاں ذیلی عناوین، تشریحی جملوں، توضیحی فٹ نوٹس اور رموز اوقاف کے ذریعہ قارئین کے لیے کتاب کو سہل بنانے کی بڑی حد تک کوشش کی ہے، وہیں عبارتوں کی تخریج اور حوالہ جات کے اہتمام سے کتاب کے معیار واستناد کو چار چاند لگادیے ہیں اور اس پر مستزاد یہ کہ جامعہ اسلامیہ دارالعلوم حیدرآباد کے شیخ الحدیث حضرت اقدس مولانا انصار علی دامت برکاتہم کی نگرانی میں اس کتاب کی ترتیب عمل میں آئی ہے، جس سے افادیت اور نافعیت کے ساتھ کتاب کی اہمیت اور استنادی حیثیت بھی دوچند ہوئی ہے اور قارئین کے لیے سامان اطمینان بھی فراہم ہوا ہے۔ **فجزاهم الله أحسن الجزاء .**

بجا طور پر مفتی عمار صاحب نے علم حدیث کی قابل رشک اور مبارک خدمت انجام دی ہے اور یہ صرف خدمت ہی نہیں؛ بلکہ وہ عبادت ہے، جس پر خود صاحب حدیث ﷺ مبارکباد پیش فرماتے ہیں: ﴿نضّر الله امرأً سمع مقالتي، فوعاها وحفظها وبلّغها؛ فرُبَّ حاملِ فقهٍ إلى مَنْ هو أفقهُ منه.﴾ اللہ تعالی اس شخص کو تر وتازہ رکھے، جس نے میری حدیث سنی، پھر اسے سمجھ کر یاد کیا اور دوسروں تک اسے پہنچایا؛ کیوں کہ بہت سے اہل علم ایسے حضرات کے پاس علم پہنچاتے ہیں، جو ان سے بھی زیادہ سمجھ اور فقہی بصیرت رکھتے ہیں۔ (ترمذی شریف، ابواب العلم عن رسول اللہ ﷺ نمبر: ۲۶۵۸)

اِس سے بڑی تبریک اور خوبصورت تہنیت کیا ہوسکتی ہے! اللہ پاک ان کی اس خدمت کو قبول عام عطا فرمائے اور خادمین حدیث کے زمرہ میں مفتی صاحب کو جگہ عنایت فرمائے اور امت کو اس سے نفع پہنچائے اور اس کتاب کو ان کے لیے، ان کے والدین اور صاحب افادات کے لیے ذخیرہ آخرت بنائے اور ہمیں بھی ان سے محبت کا صلہ عطا فرمائے۔

**أُحِبُّ الصالحين ولستُ منهم ☆ لعلّي أن أنالَ بهم شفاعة**

خاکپائے محدثین
امداد الحق بختیار
دار العلوم/ حیدر آباد
۲۲/ رجب المرجب ۱۴۳۹ھ
۱۰/ اپریل ۲۰۱۸ء بروز منگل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# عرضِ مرتب

اصولِ شریعت چار ہیں: کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماعِ امت اور قیاس، کتاب اللہ کی حیثیت متن کی ہے اور حدیث کی حیثیت شرح کی ہے، جس طرح کلامِ الٰہی کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لی ہے، اسی طرح حدیثِ نبوی کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ نے لی ہے، یہی وجہ ہے سرورِ کائنات ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا: إنـــي تـركـت فيـكـم أمرين لن تضلوا ما تمسكتم بها كتاب الله وسنة رسوله (١) میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں، جن دو کو جب تک مضبوط پکڑے رہو گے گمراہ نہ ہو گے، اللہ کی کتاب اور رسول کی سنت، اور اللہ رب العزت والجلال نے بخاری شریف کو جو مقبولیت عطا کی ہے وہ کسی صاحب عقل وفہم پر مخفی نہیں ہے اور امام شافعیؒ کا مقولہ بھی لوگوں کی زبان پر اصح الکتب بعد کتاب اللہ اشہر علی الالسنہ ہے، یہ سب امیر المومنین فی الحدیث کی اخلاص کا نتیجہ ہے، بنا بریں امام بخاریؒ نے اپنی عظیم الشان کتاب کا آغاز بھی ایسی روایت سے کیا ہے جو دین کی بنیاد اور ایک اہم روایت ہے اور علمائے اسلام کے نزدیک اس حدیث کی جامعیت اور صحت متفق علیہ ہے، اسی بنا پر امام خطابیؒ رقم طراز ہیں: صـــدر أبـو عبـد الـلـه كتـابه بحديث النية وافتتح كلامه به وهو حديث كان المتقدمون من شيـوخـنـا رحمهم الله يستحبون تقديمه أمام كل شيء ينشأ ويبتدأ من أمور الـديـن لـعـمـوم الـحـاجة إليـه في جميع أنواعها ودخوله في كل بـاب من أبـوابهـا. (٢) اور بعض اکابر علماء نے فرمایا کہ "إنــمــا الأعــمــال بــالـنيــات" یہ

(١) موطا ومشکوۃ، باب الاعتصام بالسنۃ (٢) اعلام الحدیث للخطابی آخر مقدمۃ المولف ١/١٠٦

حدیث ثلثِ علم ہے، ان ہی فضیلتوں اور خوبیوں کی بنا پر امام عبدالرحمٰن بن مہدی نے فرمایا: **من أراد أن يصنف كتابه فليبتدئ بهذا الحديث** (۱) اسی پس منظر میں بندہ کے خیال میں آیا کہ پہلی اور آخری حدیث پر کام کر کے اس کو منظر عام پر لایا جائے، اسی درمیان حضرت علامہ شیخ الحدیث مولانا محمد اکرام علی صاحبؒ کی بخاری شریف کی پہلی اور آخری حدیث کی درسی تقریریں ہاتھ لگ گئی، یہ رسالہ جو آپ کے ہاتھوں میں ہے انہی کے درسی افادات ہیں، حضرت علامہ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں اور آپ کے درس کا انداز سب سے نرالا اور پیارا تھا، لب ولہجہ کی مٹھاس، الفاظ کی صحیح نشست و برخواست، مضامین کی آمد، معلومات کی وسعت، اسلوب وانداز کی ندرت، ان جیسے سیکڑوں خوبیوں سے لبریز ہوتا تھا، حضرت علامہ کے درس میں بیٹھنے والے آج تک آپ کے درس کی تعریف کرتے ہیں؛ چنانچہ جب بندہ مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند میں ہفتم عربی کا طالب علم تھا تو کئی اساتذہ سے خصوصی روابط اور تعلق تھے، انہیں میں سے جامع المعقول والمنقول حضرت مولانا مفتی خورشید انور صاحب گیاوی دامت برکاتہم (استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند) ہیں، میں نے بارہا حضرت والا کی زبان سے سنا کہ حضرت علامہ نے جو ابوداؤد شریف کا ایک سبق دارالعلوم دیوبند میں پڑھایا ویسا درس اور ویسی تقریر آج تک میں نے نہیں سنی۔

ترتیب میں بندہ نے ان امور کا خاص خیال رکھا جو مندرجہ ذیل ہے:

۱- حدیث کے بعد تخریج حدیث
۲- حدیث کا ترجمہ
۳- مرکزی اور ذیلی عنوانات
۴- راوی حدیث کا مختصر تعارف
۵- اور حوالہ جات کا خصوصی اہتمام

حضرت علامہ کے برادرِ عزیز محدث جلیل، استاذ العلماء، نمونۂ اسلاف، تلمیذِ شیخ الاسلام حضرت مولانا محمد انصار صاحب دامت برکاتہم شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ دارالعلوم حیدرآباد

---

(۱) کتاب الاذکار ۱/۶۶

کو بندہ نے یہ رسالہ از اول تا آخر حرف بہ حرف سنایا، حضرت شیخ الحدیث نے بعض جگہ تنبیہ کی اور بعض حوالہ کی طرف رہنمائی فرمائی اور مفید مشوروں سے بھی نوازا۔ (**فجزاہ اللہ تعالیٰ عنا وعن جمیع المسلمین**)

میں حضرت شیخ الحدیث دارالعلوم حیدرآباد کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے گوناگوں مصروفیات کے باوجود تقریظ لکھ کر اس کتاب کو زینت بخشی اور دست بدعا ہوں کہ باری تعالیٰ حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم کو اپنے شایان شان بدلہ عطا فرمائے، نیز محبّ مکرم جناب مولانا مفتی امداد الحق بختیار صاحب قاسمی (استاذ حدیث ورئیس التحریر الصحوۃ الاسلامیہ دارالعلوم حیدرآباد) کا بے حد ممنون ومشکور ہوں کہ جنہیں اللہ تعالیٰ نے بے شمار خوبیوں اور کمالات سے نوازا ہے، عربیت میں آپ کو ید طولیٰ حاصل ہے، مفتی صاحب نے عرق ریزی سے تصحیح کے مراحل کو بحسن وخوبی اختتام کو پہونچایا اور تقریظ لکھ کر ہماری حوصلہ افزائی فرمائی اور کئی اہم اور مفید مشوروں سے بھی نوازا، اسی طرح مخلص دوست مولانا محمد بُشَیر صاحب معروفی قاسمی (دارالعلوم حیدرآباد) نے بھی تصحیح وسیٹنگ کے مراحل کو اختتام تک پہنچانے میں میری بھرپور معاونت کی ہے، میں ان کا بھی دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ ان کو اجر جزیل عطا فرمائے اور اپنے مقبول بندوں میں ان کو شامل فرمائے، آمین۔

یہ راقم الحروف کی پہلی کاوش ہے، بہت ممکن ہے کہ تصحیح کے باوجود غلطیاں رہ گئی ہوں، قارئین کتاب کو اگر کوئی غلطی نظر آئے تو از راہ کرم مطلع فرمائیں؛ تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح کردی جائے۔ (**فجزاهم الله تعالى عنا وعن جميع المسلمين**)

اخیر میں دست بدعا ہوں اللہ تعالیٰ میری اس کاوش کو قبول فرمائے اور اس کو میرے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے اور اس میں جو غلطیاں اور کوتاہیاں رہ گئی ہوں اس سے درگذر فرمائے۔ (آمین)

العبد عمار غفرلہ

خادم تدریس دارالعلوم حیدرآباد

۲۰/۷/۱۴۳۹ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# بخاری شریف کی پہلی حدیث

حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيْدٍ الأَنْصَارِيُّ قَالَ أَخْبَرَنِي مُحَمَّدُ بْنُ إِبْرَاهِيْمَ التَّيْمِيُّ أَنَّهُ سَمِعَ عَلْقَمَةَ بْنَ وَقَّاصٍ اللَّيْثِيَّ يَقُولُ سَمِعْتُ عُمَرَبْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَلَى الْمِنْبَرِ يَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِءٍ مَا نَوَى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُه إِلىٰ دُنْيَا يُصِيْبُهَا أَو إِلىٰ امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلىٰ مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ.

ترجمہ: امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ہم سے بیان کیا حمیدی نے، حمیدی نے کہا ہم سے بیان کیا سفیان نے، انہوں نے کہا ہم سے بیان کیا یحییٰ بن سعید انصاری نے، انہوں نے کہا مجھ کو خبر دی محمد بن ابراہیم تیمی نے، انہوں نے کہا علقمہ بن وقاص لیثیؒ فرماتے ہیں میں نے حضرت عمر بن خطابؓ کو منبر پر یہ حدیث بیان کرتے سنا کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اعمال کا نیتوں سے موازنہ کیا ہوا ہے اور انسان کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی ہے یعنی عمل کا ثمرہ نیت پر مرتب ہوتا ہے، مثلاً جس نے دنیا کمانے کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اسی چیز کے لیے ہے، جس کی اس نے نیت کی ہے یعنی اس کی ہجرت لاحاصل ہے، اس کا کوئی ثواب نہیں ملے گا۔

## شیخ حمیدی(۱) کی روایت سے کتاب کا آغاز کرنے میں نکتہ

شیخ حمیدیؒ، امام بخاریؒ کے مشہور اساتذہ میں ہیں، ایک قبیلے کی طرف منسوب

(۱) یہ امام بخاری کے استاذ ابوبکر عبداللہ بن الزبیر بن عیسیٰ القرشی الاسدی الحمیدی المکی ہیں، یہ امام شافعیؒ کے =

ہیں، امام بخاریؒ نے سند کے اندر بھی کچھ نکتوں کا لحاظ رکھا ہے؛ چنانچہ سب سے پہلے شیخ حمیدی کی روایت لائے ہیں، ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مکہ کے رہنے والے تھے اور سلسلۂ نسب حضرت خدیجہؓ اور نبی کریمؐ کے خاندان سے ملتے ہوئے، قریش سے جا ملتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے: " قَدِّمُوْا قُرَيْشًا " (۱) کہ ہر معاملے میں قریش کو آگے رکھا کرو، کہیں فرمایا: " اَلْأَئِمَّةُ من قُرَيْشٍ " (۲) یعنی پیشوائی کے حقدار قریش ہیں، امام بخاریؒ نے بھی یہ نکتہ سامنے رکھا اور بخاری شریف کی سب سے پہلی حدیث میں قریشی حمیدی کی سند کو مقدم رکھا؛ تاکہ اس حدیث پر عمل ہو جائے۔

## سفیان سے کون مراد ہیں؟

یہاں سفیان بالکل عام (انداز میں بیان کیا گیا) ہے، اور سفیان سے کون مراد ہیں؟ جب تک نسب، نسبت اور تعارف نہ ہو، پتہ نہیں چل سکتا۔ (لہٰذا جاننا چاہیے کہ)

---

= ہم عصر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے طلب حدیث کے ساتھی ہیں، امام شافعیؒ سے انہوں نے فقہ کا علم حاصل کیا، آپ کے ساتھ مصر کا سفر کیا اور پھر جب آپ کا انتقال ہوا تو مکہ مکرمہ لوٹ آئے، ان کی وفات ۲۱۹ھ میں ہوئی (فتح الباری ۱/۱۰) ان کی تصنیف میں سے مسند حمیدی بہت مشہور ہے اور علامہ حبیب الرحمٰن اعظمی کی تحقیق کے ساتھ دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے، ان کے علاوہ ایک حمیدی اور ہیں، ان کا نام ابو عبد اللہ محمد بن ابی نصر فتوح الحمیدی الاندلسی ہیں، یہ پہلے والے حمیدی سے متاخر ہیں، ان کی کتاب الجمع بین الصحیحین مشہور ہے، جس میں انہوں نے صحیحین کی احادیث کو جمع کیا ہے، ان کی وفات ۴۸۸ھ میں ہوئی۔ (کشف الظنون ۱/۵۹۹)

(۱) قوله في رواية أخرى قدموا قريشا ولا تقدموها، أخرجه عبد الرزاق، فتح الباری ۶/۶۱۳، المکتبۃ السّلفیہ-رواه الطبراني، وفيه أبو معشر وحديثه حسن وبقية رجاله رجال الصحيح، قال الهيثمي (انظر مجمع الزوائد ۱۰/۲۵، کتاب المناقب، باب فضائل قریش-وانظر أيضا التلخیص الحبیر ۲/۳۶، کتاب صلاۃ الجماعۃ، رقم: ۵۷۹)

(۲) رواہ احمد فی مسندہ ۳/۱۲۹ و۱۸۳ من حديث أنس بن مالكؓ ومن حديث أبي بكر الصديق بلفظ الأئمة من قريش ورجاله رجال الصحيح (فتح الباری ۱۳/۱۱۲، المکتبۃ السّلفیہ- بخاری شریف ۲/۱۵۷، کتاب الاحکام)

یہاں سفیان بن عیینہؒ مراد ہیں۔ (۱)

ان کے استاذ یحییٰ بن سعید انصاری (۲) ہیں، ان کے استاذ محمد بن ابراہیم تیمی (۳) ہیں، ان کے استاذ علقمہ بن وقاص لیثی ہیں، انھوں نے یہ حدیث عمر بن خطاب (۴) سے سنی ہے۔

## ایک غلط فہمی کا ازالہ/ بخاری شریف کے راویوں میں امام بخاری کی شرط

امام بخاری کے شرائط میں امام حاکم ایک شرط یہ بیان کرتے ہیں کہ امام بخاری اپنی کتاب میں صرف اسی حدیث کو لاتے ہیں، جس کے راوی صحابہ سے لے کر نیچے تک ہر طبقے میں دو، دو ہوں، جس حدیث کی سند میں ہر ہر طبقہ میں دو، دو راوی نہ ہوں، امام بخاری ایسی حدیث کو ذکر نہیں کرتے۔ (۵)

امام حاکم کی یہ بات پہلی ہی روایت میں غلط (ثابت) ہو جاتی ہے؛ کیونکہ ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ'' کی حدیث کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ صحابہ میں سوائے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے کوئی یہ روایت نقل کرنے والا نہیں ہے؛ حالانکہ حدیث کے الفاظ

---

(۱) یہ سفیان بن عیینہ بن میمون، ابو محمد الکوفی ہیں، ان کی وفات ۱۹۸ھ میں ہوئی، عمدۃ القاری ۱/۱۷، اسی نام کے دوسرے بزرگ سفیان بن سعید بن مسروق ثوری ہیں، یہ ان سے متقدم اور ان کے استاذ ہیں، ان کی وفات ۱۶۱ھ میں ہوئی۔ (خلاصۃ الخزرجی، ص: ۱۴۵)

(۲) یہ یحییٰ بن سعید بن قیس بن عمرو الانصاری المدنی ہیں، ان کے دادا قیس بن عمرو صحابی ہیں اور یہ خود صغار تابعین میں سے ہیں۔ (فتح الباری ۱/۱۰)

(۳) محمد بن ابراہیم بن حارث بن خالد تیمی، اوساط تابعین میں ان کا شمار ہوتا ہے، حوالہ سابق، یہ کبار تابعین میں سے ہیں، حتی کہ بعض حضرات نے ان کو صحابی قرار دیا ہے؛ لیکن یہ بات درست نہیں، صحیح یہ ہے کہ یہ کبار تابعین میں سے ہیں۔ (حوالہ سابق)

(۴) یہ خلیفہ ثانی عمر بن خطابؓ ہیں، عشرۂ مبشرہ (یعنی وہ دس خوش نصیب حضرات جن کو ایک مجلس میں رسول اللہ ﷺ نے جنت کی خوشخبری دی) میں ہیں، آپ کے فضائل ومناقب بے شمار ہیں۔ (الاصابہ ۲/۵۱۸-۵۱۹)

(۵) شروط الائمۃ الستۃ للمقدسی، ص: ۱۷- شروط الائمۃ الخمسۃ للحازمی، ص: ۳۷ بحوالہ کشف الباری ۱/۲۳۹

ہیں کہ حضرت عمرؓ نے یہ حدیث منبر پر کھڑے ہوکر بیان کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے بھرے مجمع میں یہ حدیث بیان کی ہے؛ پھر بھی صحابہ میں حضرت عمرؓ کے سوا کوئی اس حدیث کا راوی نہیں ہے، تابعی میں حضرت عمرؓ سے روایت کرنے میں علقمہ بن ابی وقاص لیثیؒ منفرد ہیں، علقمہ سے یہ حدیث نقل کرنے میں محمد بن ابراہیم تیمی منفرد ہیں اور محمد بن ابراہیم تیمی سے نقل کرنے میں یحییٰ بن سعید انصاری بھی منفرد ہیں۔

یہاں تک تو انفراد ثابت ہوگیا؛ البتہ یحییٰ بن سعید انصاری سے نقل کرنے والے بہت سارے راوی ہیں، تو راویوں میں تعدد یحییٰ بن سعید انصاری سے نیچے ہے، حافظ (ابن حجر) نے ذکر کیا ہے کہ ان سے نقل کرنے والے دوسو، تین سو ہیں، حافظ نے اس پر کلام کیا ہے کہ میں نے تتبع کیا تو سو بھی نہیں پہونچے (۱) خلاصہ یہ کہ امام حاکم کی مذکورہ بات (کہ ہر طبقہ کے اندر متعدد راوی کا ہونا ضروری ہے) پہلی ہی روایت میں ٹوٹ جاتی ہے ؛لہذا بخاری کی ہرگز یہ شرط نہیں، ہاں بخاری کی شرط یہ ہے کہ راوی اعلیٰ درجہ کا ہونا چاہیے، چاہے ایک ہی راوی ہو؛ مگر صحاح کا راوی ہونا چاہیے جس کا ضبط تام ہو، بس اتنی ہی شرط ہے۔ اور امام حاکم کی بات نہ بخاری شریف کی پہلی روایت میں صادق آرہی ہے اور نہ ہی آخری روایت میں؛ کیونکہ آخری روایت ہے: "كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ" الخ، وہاں بھی راویوں کے اندر تعدد نہیں ہے۔

مِنْبَرْ: نَبَرٌ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی بلندی کے آتے ہیں، سطح زمین سے بلند جگہ کو منبر کہتے ہیں، اس کی جمع "مَنَابِرُ" آتی ہے۔

یہ روایت تین ٹکڑوں کا مجموعہ ہے (۱) ایک جملہ ہے: **إنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ**. (۲) دوسرا جملہ ہے: **وانما لكل امرئ مانوىٰ**. (۳) تیسرا جملہ ہے: **ومن كانت هجرته إلى دنيايصيبها أو امرأة ينكحها فهجرته إلى ما هاجر إليه.**

---

(۱) فقد تتبعت طرقه من الروايات المشهورة والأجزاء المنثورة منذ طلبت الحديث إلى وقتي هذا فما قدرت على تكميل المائة. (فتح الباری ۱/۱۵، مکتبہ دارالسلام، ریاض)

تو پوری حدیث تین اجزاء کا مجموعہ ہوئی؛ اس لئے ضروری ہے کہ ہر جملے پر الگ الگ گفتگو کی جائے؛ کیوں کہ یہ پہلی روایت اہم اور بنیادی روایت ہے، اسی لحاظ سے ہم کو اس پر غور بھی کرنا ہے۔

## اِنَّمَاالْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ

یہ پہلا جملہ تین کلموں کا مجموعہ ہے: (۱) اِنَّــمَــا (۲) الْأعْـمَــالُ (۳) بِـالنِّیَاتِ. پہلے جملے میں یہ تین الفاظ ہیں، پہلے ان تینوں لفظوں پر ایک گہری نظر ڈالی جائے پھر علیحدہ علیحدہ معنی اور مطلب نکالیں۔

## لفظ '' اِنَّمَا '' کی تحقیق

لفظ '' اِنَّمَا'' بظاہر تو سمجھ میں آتا ہے کہ دو حرف کا مجموعہ ہے: ''اِنَّ '' اور ''مَا'' اور لفظ ''اِنَّ '' اثبات کے لیے آتا ہے اور ''مَـا'' نفی کے لئے ہے، اب بڑا اعتراض ہوگا کہ ایک ہی جگہ پر نفی اور اثبات دونوں جمع ہو رہے ہیں حالانکہ یہ اجتماع ضدین ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ '' اِنَّـمَا'' الگ الگ اثبات اور نفی کے لیے آتا ہے؛ لیکن اب دونوں کو ملا کر ایک ہی بنا دیا گیا ہے، دونوں ایک کلمہ ہو گئے؛ گویا کہ ان کو اپنی اصلی وضع پر باقی نہیں رکھا گیا ہے؛ کیوں کہ اصلی وضع میں تو ''اِنَّ '' اور ''مَــــا'' الگ ہیں؛ لیکن استعمال میں دونوں کو ملا کر ایک بنا دیا گیا، اب ''اِنَّمَا'' کونسا معنی دیتا ہے؟ تو '' اِنَّمَا'' حصر کا معنی دیتا ہے اور حصر میں وہی شکل ہے، جو شکل موصوف کا حصر صفت کے اندر اور کبھی صفت کا حصر موصوف کے اندر کی ہوتی ہے، یہاں '' اِنَّمَا '' حصر کے لئے ہے۔

ذرا بات اور واضح کر کے کہہ سکتے ہیں کہ کلمہ (اِنَّمَا) '' مَا'' اور ''اِلَّا'' کا معنی دیتا ہے، جس میں حصر کے معنی بہت واضح ہوتے ہیں، جیسے کہتے ہیں '' مَـا زَیْدٌ اِلَّا قَائِمٌ '' زید کے لئے قیام کا انحصار اس طرح کر دیا گیا کہ ''مـا'' کے ذریعہ قیام کے علاوہ کی نفی کر دی گئی اور ''اِلَّا '' کے ذریعہ قیام کا اثبات کر دیا گیا اور حصر کے معنی ہو گئے کہ زید تو کھڑا ہی ہے، حصر

کے یہی معنیٰ " اِنَّـمَـا " کے بھی ہیں: قرآن میں ہے: ﴿اِنَّـمَـا تُـجْـزَوْنَ مَـا كُـنْـتُـمْ تَـعْـمَـلُوْنَ﴾ اس آیت میں " اِنَّـمَـا " کا لفظ ہے، دوسری جگہ ہے: ﴿مَـا تُجْـزَوْنَ اِلَّا مَـا كُـنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی بات کو ایک جگہ " اِنَّمَا " سے تعبیر کیا ہے، پھر اسی بات کو دوسری جگہ " مَـا " اور "اِلَّا" سے تعبیر کیا ہے اور ایک جگہ ہے: ﴿اِنَّـمَـا عَلٰى رَسُـوْلِـنَـا الْبَلَاغُ الْـمُبِيْـنُ﴾ دوسری جگہ ہے: ﴿مَـا عَـلَـى الـرَّسُـوْلِ اِلَّا الْبَلَاغُ﴾. حدیثوں سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ " اِنَّـمَـا " حصر کے لئے آتا ہے، جیسے: " اِنَّمَا الْمَاءُ مِنَ الْمَاءِ " (۱) اس حدیث کا مطلب ہے کہ غسل اس وقت ہوگا جب انزال ہو، پہلے ماء سے مراد پانی کا استعمال ہے اور دوسرے ماء سے مراد ہے خروج منی؛ چنانچہ معلوم ہوا پانی کا استعمال اسی وقت ہوگا جب انزال ہو جائے، پہلے بڑے بڑے صحابہؓ نے اس حدیث کا یہی مطلب مراد لیا تھا؛ چاہے بعد میں رجوع کر لیا ہو، چنانچہ اس حدیث کو سامنے رکھ کر بہت سے صحابہؓ نے یہ مذہب اختیار کیا کہ بغیر انزال کے غسل واجب نہیں ہوتا اور جن حضرات نے ان صحابہؓ کی تردید کی ہے، انہوں نے ان کے " اِنَّـمَـا " کے استدلال کی تردید نہیں کی ہے، کیوں کہ وہ حضرات بھی مانتے ہیں کہ " اِنَّمَا " حصر کے لئے ہے، ہاں اس طرح تردید کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس حکم کو بعد میں منسوخ فرما دیا تھا، جس کی دلیل یہ روایت ہے: "اِذَا الْتَقَى الْخَتَانَان وغابت الحشفة فقد وجب الغسل أنزل أو لم ينزل" (۲) یہ بات حدیث سے بھی معلوم ہوگئی کہ " اِنَّمَا " حصر کے لئے آتا ہے؛ حاصل یہ کہ اب یہ بات متعین ہوگئی کہ " اِنَّمَا " یہاں " مَا " اور "اِلَّا" کے معنیٰ میں ہے۔

اگر ہم تقدیری عبارت نکالیں گے تو اس طرح نکالیں گے: مَـا الْاَعْـمَـالُ اِلَّا بِالنِّيَاتِ. اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ: مَا اَنَا اِلَّا بَشَرٌ. اِنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ: مَا اِلٰهُكُمْ اِلَّا اِلٰهٌ

(۱) عن أبي سعيد قال قال رسول الله ﷺ إنما الماء من الماء، رواه مسلم، باب الغسل مشکوۃ، ص:۴۷

(۲) ترمذی شریف، ص:۱۸۰، کتاب النکاح

وَّاحِدٌ. اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ: مَاحَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا الْمَيْتَةَ. حصر کے معنیٰ قرآن وحدیث سے ثابت ہوگئے۔

## لفظ ''الأعمال'' کی تحقیق

یہ لفظ جمع ہے اور اس پر الف لام جنسی داخل ہے یا استغراقی ؟ اگر الف لام استغراقی ہو تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے تمام افراد اس میں شامل ہیں، کوئی فرد اس سے چھوٹا نہیں ہے؛ لہٰذا ''الأعمال'' میں تمام عمل آ گئے، معلوم ہوا کہ عمل کی بہت قسمیں ہوتی ہیں؛ متعدد اقسام بتلانے کے لئے جمع کا صیغہ لایا گیا؛ چنانچہ عمل ہاتھ کا بھی ہوتا ہے، عمل پاؤں کا بھی ہوتا ہے، عمل زبان کا بھی ہوتا ہے، آنکھ کا بھی ہوتا ہے اور کان کا بھی، یہ اعمال جوارح ہیں، جب جمع کا صیغہ کالایا گیا تو ان تمام چیزوں کا عمل ''الأعمال'' میں داخل ہوگیا، اور اسی عموم کو بتانے کے لیے جمع کا صیغہ بھی لایا گیا اور اس پر الف لام بھی داخل کیا گیا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جب جمع پر الف لام داخل ہو تو اس کی جمعیت ختم ہو جاتی ہے ،اس کے اندر استغراق کے معنیٰ آ جاتے ہیں، لہٰذا ''الاعمال'' کے اندر عمل کے سارے افراد آ گئے؛ حتیٰ کہ اگر دیکھا جائے تو اس میں عمل قلب بھی آ سکتا ہے؛ کیوں کہ جیسے جوارح کا عمل ہوتا ہے، ایسے ہی قلب کا بھی عمل ہوتا ہے، حاصل یہ کہ ''الأعمال'' کا الف لام استغراقی ہے۔

## ''بالنیات'' کی ''ب'' کی تحقیق

''بالنیات'' میں ''ب'' کو اگر مصاحبت کے لئے مان لیں، تو اس صورت میں مطلب ہوگا کہ اعمال نیت کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں: عمل کو نیت سے الگ نہیں کیا جاسکتا ہے اور اگر ''ب'' کو سبب کے لیے مانیں تو مطلب ہوگا کہ تمام عمل کے وجود کے لئے نیت سبب ہے: جب تک نیت موجود نہ ہو کوئی عمل موجود ہو ہی نہیں سکتا، ہر عمل کے وجود کا سبب نیت ہے، اب دونوں (عمل اور نیت) میں فرق ہوگیا؛ اس لیے کہ نیت عمل سے

پہلے ہوگی؛ کیونکہ سبب مسبب سے پہلے ہوتا ہے۔

## کلمہ ''النیات'' کی تحقیق

نِیَّـــاتٌ: نِیَّةٌ کی جمع ہے، لغت میں نیت کے معنی ارادہ کے ہیں اور ارادہ کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ اصطلاح شریعت میں نیت کی تعریف ہے: دل کو متوجہ کرنا، ایسے کام کی طرف جس کام میں کرنے والے کا فائدہ ہو یا کرنے والا نقصان سے بچ جائے (۱) مثلاً ہم کو نماز پڑھنی ہے؛ تاکہ ہمیں جنت مل جائے اور ہمیں نماز پڑھنی ہے؛ تاکہ ہم جہنم سے بچ جائیں؛ نمازیوں کی یہ غرض یقیناً ہوتی ہے۔

## نیت کی نسبت اللہ کی طرف نہیں کی جاتی

جس کام کے اندر غرض نہ ہو اس کو نیت نہیں کہا جاتا ہے، اسی بنا پر کہیں آپ نے نہیں سنا ہوگا کہ نیت کی نسبت اللہ کی طرف کی جاتی ہو، نیت کی نسبت اللہ کی طرف نہیں کی جاتی اور '' نَـــوى الـــلّٰـــهُ '' (اللہ نے نیت کی) نہیں کہا جاتا؛ کیونکہ اللہ کا کام ''مُعلَّل بالاغراض'' نہیں ہوتا، وہ غرض کی وجہ سے کام نہیں کرتا، اس کو کسی فائدہ کی ضرورت نہیں اور اس کو کسی نقصان سے خطرہ نہیں ہے (۲) ہاں اللہ کے لئے ''ارادہ'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے: کہا جاتا ہے: **اَرَادَ اللّٰهُ، فعال لمايريد،** ﴿**إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئاً أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ.**﴾ (یس:۸۲)

خلاصہ یہ کہ نیت کا تعلق دو جز (نفع حاصل کرنا اور نقصان سے بچنا) سے ہے؛ لیکن

---

(۱) قال النووي: النية القصد وهي عزيمة القلب وقال البيضاوي: النية عبارة عن انبعاث القلب نحو ما يراه موافقا لغرض من جلب نفع أو دفع ضرر حالا أو مآلا، بحوالہ فتح الباری ۱/۱۳، دارالمعارف، بیروت-والشرع خصصه بالإرادة المتوجهة نحو الفعل لابتغاء رضاء الله وامتثال حكمه. (فتح الباری ۱/۱۳)

(۲) حاصله أن النية لما اعتبر فيها الغرض فلو أطلق لفظ النية في جنابه تعالى لأوهم تعليل أفعاله بالأغراض مع أنهم قالوا: إن أفعاله لا تُعلَّل بالأغراض، فیض الباری ۱/۵)

اب اصطلاحِ شریعت میں نیت کا معنی اخلاص سے کرتے ہیں (۱) یعنی میں نے نیت کرلی، اس کا مطلب ہے: اللہ کی رضا کا ارادہ کرلیا، لہٰذا جب نیت بولیں گے تو اخلاص کا معنی مراد ہوگا۔

## لفظ ''النیات'' کو جمع لانے کی وجہ

نِیَّـــاتٌ جمع کا صیغہ ہے، جیسے اعمال جمع ہے؛ عمل کی مختلف نوع کو بتانے کے لیے ہے، ویسے ہی '' نِیَّـــاتٌ'' نیت کی مختلف قسموں کو بتانے کے لئے ہے، مثلاً کسی کی نیت ہوتی ہے کہ اللہ راضی ہوجائے، یہ سب سے اعلی درجہ ہے اور کسی کی نیت ہوتی ہے کہ اللہ خوش ہوکر جنت میں داخل کردے یہ اس سے نیچے درجہ کی چیز ہے اور ایک نیت جہنم سے بچنے کی ہے۔

## ہر عمل کے لیے مستقل نیت ضروری ہے

اب دونوں لفظ (''الأعـــمـال'' اور '' نِیَّـاتٌ'' ) کو سامنے رکھ کر پہلے اس جملہ کی تقدیری عبارت نکال کر مطلب نکالیں: '' اَلْاَعْـمَالُ بِالنِّیَّاتِ'' میں اعمال بھی جمع اور نیات بھی جمع کا صیغہ ہے اور شرح وقایہ میں یہ قاعدہ لکھا ہے کہ جب جمع کا مقابلہ جمع سے ہو تو اس سے ''انـقسام الآحاد علی الآحاد'' مراد لیتے ہیں؛ چنانچہ قرآن میں ہے: ﴿ وَأَیْدِیَکُمْ إِلَی الْـمَرَافِقِ﴾ ایدی بھی جمع ہے اور الـمرافق بھی، تو آیت کا مطلب ہے: لِـکُلِّ یَدٍ مِــرْفَــقٌ (۲) یعنی ہر ہاتھ میں الگ الگ ایک کہنی ہے، یہ مطلب نہیں کہ مجموعی (دونوں)

---

(۱) النیة والإخلاص في الأعمال. (فتح الباری ۱/۱۴۱، مکتبہ سلفیہ)

(۲) وذلك لأنـه تـعـالـی اختـار لفظ الجمع في أعضاء الوضوء فأريد بمقابلة الجمع بالجمع انـقسـام الآحاد علی الآحاد، شرح وقایہ ۱/۵۴، وقـال الـمـحشـي: حاصله أنه قد قرر في مقره أن مقابلة الجمع بالجمع تقتضي انقسام الآحاد علی الآحاد كقولهم ركبوا دوابهم بمعنی أن كل واحـد فـلا ركـب راتبة هـكذا أن في كل يد مرفقا واحدة لمقابلة المرافق بالأيدي. (حاشی علی شرح الوقایہ ۱/۵۴)

ہاتھ میں ایک کہنی ہے،(یا ہر ہاتھ میں دو کہنیاں ہیں) اسی قاعدہ کے اعتبار سے حدیث "**إنما الأعمال بالنيات**" کا مطلب بھی ہوگا: **لِكُلِّ عَمَلٍ نِيَّةٌ**، (یعنی ہر عمل کی الگ نیت ہے) اور اعمال متعدد تو نیت بھی متعدد، دونوں کلمہ کو جمع لا کر کے قاعدہ کی رو سے یہی تقدیری عبارت نکلتی ہے۔

بعض روایت میں "**إنما الأعمال بالنية**" بھی ہے(۱) اس روایت میں اعمال کو جمع اور لفظِ نیت کو مفرد لا کر اشارہ کر دیا کہ عمل کی مختلف اقسام کے ساتھ ساتھ، عمل کے صدور کے لیے متعدد اعضاء و جوارح ہیں، جبکہ نیت کے صدور کی لیے صرف دل ہے، اور کوئی عضو اس کے صدور کے لیے نہیں، واحد عضو سے نیت کا صدور ہوتا ہے۔

## "**الأعمال**" سے کس قسم کے اعمال مراد ہیں؟

اعمال جمع کا صیغہ ہے تو کیا تمام طرح کے عمل اس کے اندر داخل ہیں؟ اگر ہر عمل کو اس میں داخل کیا جائے تو معنی غلط ہو جائے گا؛ کیونکہ عمل دو طرح کا ہوتا ہے(۱) ایک عمل ہوتا ہے عمل اختیاری: آدمی اپنے اختیار سے کوئی کام کرتا ہے(۲) اور بعض کام ہوتے ہیں بلا قصد و ارادہ، جیسے: چل رہے تھے کہ گر پڑے۔ گرنا بھی تو ایک عمل ہے، اب اگر اعمال کے اندر غیر اختیاری عمل بھی داخل ہوتا ہے تو وہاں نیت کہاں پائی جاتی ہے؟ اور اسی طرح افعال اضطراری بغیر نیت کے صادر ہوتے ہیں؛ اس لئے کہنا پڑے گا کہ یہاں اعمال سے مراد

---

(۱) امام بخاری نے یہ روایت بدء الوحی کے علاوہ مزید چھ جگہوں میں تخریج کی ہے: **الأول في الإيمان في باب ما جاء أن الأعمال بالنية،** کتاب الایمان والنذور، باب النیۃ فی الایمان، **الثاني: في العتق في باب الخطأ والنسيان في العتاقة ونحوه عن علقمة قال سمعت عمرؓ يقول عن النبيﷺ الأعمال بالنية ولامرئ ما نوى فمن كانت هجرته الخ، الثالث: في باب هجرة النبي عليه السلام عن علقمة سمعت عمرؓ قال سمعت النبيﷺ يقول الأعمال بالنية الخ، الرابع: في النكاح العمل بالنية الخ، الخامس: في الأيمان والنذور إنما الأعمال بالنية الخ، السادس: في باب ترك الحيل إنما الأعمال بالنية الخ.** (عمدۃ القاری ۱/۴۷، زکریا بکڈپو)

اعمال اختیاری ہیں، غیر اختیاری اعمال خارج ہیں، کیوں کہ ان میں نیت کی ضرورت نہیں پڑتی، لہٰذا عمل میں ایک تو یہ قید (قصد وارادہ اور نیت) لگانی پڑے گی۔

عمل میں ایک دوسری قید بھی ہے، جس کی تشریح یہ ہے کہ عمل تو بہت سوں سے صادر ہوتے ہیں: کافر سے بھی عمل صادر ہوتا ہے، مسلمان سے بھی عمل صادر ہوتا ہے اور عمل نابالغ بچے سے بھی صادر ہوتا ہے، پاگل سے بھی صادر ہوتا ہے، سوئے ہوئے انسان سے بھی کچھ حرکتیں صادر ہوتی ہیں؛ لہٰذا یہاں بھی اعمال کے اندر تخصیص کرنی پڑے گی کہ اعمال سے مراد یہاں مکلّف کا فعل ہے، غیر مکلّف کا فعل نہیں؛ کیونکہ نابالغ بچے میں شعور نہیں ہوتا، نابالغ بچے کا عمل اس حدیث سے خارج ہے؛ اس لئے کہ اس کی نیت کا اعتبار نہیں، اسی طرح سویا ہوا آدمی ہے، اس میں بھی نیت نہیں ہوتی۔

کافر اگرچہ صحیح قول کے مطابق فروعات کا بھی مکلّف ہے؛ لیکن زمانۂ کفر کی اس کی نیت کا اعتبار نہیں ہے، کافر کفر کے اندر ہزار نماز پڑھے؛ مگر اللہ کے نزدیک اس کا کوئی اعتبار نہیں، کوئی ثواب نہیں؛ لہٰذا وہ مکلّف تو ہے؛ لیکن اس کے عمل کا کوئی اعتبار نہیں (۱) اور ''**إنما الأعمال**'' سے یہاں مراد، وہ عمل ہے جو شرعاً معتبر ہو اور شرعا معتبر مسلمانوں کا عمل ہوتا ہے کافر کا نہیں۔ معلوم ہوا کہ عمل سے مراد ایسا عمل ہے جو اختیاری ہو اور ایسے مکلّف سے صادر ہو، جن کا عمل شرعا معتبر ہے۔

## کلمہ ''ب'' کا متعلَّق کیا ہے؟

ایک چیز یہ بھی سمجھ لیجئے جو بہت مشہور بحث ہے: ''بِالنِّيَاتِ'' میں ''ب'' حرف جار ہے اور تمام حروف اپنے معنی بتلانے میں اپنے متعلَّق کے محتاج رہتے ہیں جب تک ان

---

(۱) والتقدير الأعمال الصادرة من المكلفين وعلى هذا هل تخرج أعمال الكفار؟ الظاهر الإخراج لأن المراد بالأعمال أعمال العبادة وهي لا تصح من الكافر وإن كان مخاطبا بها معاقبا على تركها. (فتح الباری ۱/۱۷، دارالسلام، ریاض)

کا متعلق محذوف نہ نکالیں حروف اپنا معنی نہیں دیں گے ۔حرف کی تعریف ہے: ایسا کلمہ جو مستقل معنی نہ رکھتا ہو، حروف کو ایسے سمجھئے جیسے کوئی بچہ چلنا نہیں جانتا ہے اس کو انگلی پکڑ کر چلاتے ہیں، اگر چھوڑ دیں گے تو گر جائے گا، جب تک پکڑے رہیں گے چلتا رہے گا؛ یہی حال حرف کا ہوتا ہے: جب متعلق محذوف کو نکالیں گے تو معنی بتائے گا، اور اگر ہٹا دیں تو معنی نہیں بتائے گا، بالکل اسی بچہ کی طرح، جو خود بے سہارا ہو چلنا نہ جانتا ہو؛ اس لئے یہاں ''ب'' چاہتی ہے کہ اس کا کوئی عامل ہونا چاہیے، متعلق ہونا چاہیے؛ تاکہ ''ب'' اپنا معنی بتا سکے۔

اتنی بات میں تو احناف اور شوافع سب متفق ہیں کہ تقدیری عبارت نکالنی ہوگی بغیر اس کے معنی پورے نہیں ہوں گے؛ لیکن اب کیا تقدیر نکالیں؟ تو اس میں شوافع اور احناف میں اختلاف ہے: حضرات شوافع کہتے ہیں ہم ''ب'' کا متعلق '' صحة ''نکالیں گے، تقدیری عبارت ہوگی: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ تَصِحُّ بِالنِّيَاتِ. حضرات شوافع اپنا مدعی اور مطلب ایسے نکال رہے ہیں کہ '' ب'' کا متعلق '' تَصِحُّ'' محذوف مان رہے ہیں اور صحت کہتے ہیں: (ایسے عمل کو) جس کے اندر شرائط اور فرائض دونوں کا خیال رکھا جائے، جس کے اوپر کسی چیز کا وجود موقوف ہو، بغیر اس کے وہ چیز موجود نہ ہو سکے، اس کو صحیح کہا جاتا ہے؛ لہذا ان حضرات نے ایک مسئلہ نکالا کہ اعمال کے عموم میں وضو بھی داخل ہے اور جب '' بِالنِّيَاتِ'' کا متعلق صحت ہے تو معلوم ہوا کہ بغیر نیت کے وضو صحیح نہیں ہوتا، یہی امام شافعیؒ کے نزدیک مسئلہ ہے کہ وضو میں نیت شرط ہے۔(۱)

احناف کہتے ہیں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے؛ بلکہ '' ب'' کا متعلق ثواب ہے اور تقدیری عبارت ہے: '' اِنَّمَا الْاَعْمَالُ تُثَابُ بِالنِّيَّاتِ'' اور مطلب ہے کہ اعمال کا مدار نیت پر صحت کے اعتبار سے نہیں؛ بلکہ ثواب حاصل کرنے کے لئے ہے احناف کے نزدیک

(۱) بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد ۸/۱، کتاب الوضوء، الباب الثانی، المسئلۃ الاولیٰ من الشروط

بغیر نیت کے وضو صحیح ہو جائے گا؛ لیکن اس وضو پر ثواب نہیں ملے گا۔ یہ اختلاف کی بنیاد ہوگئی کہ شوافع ''ب'' کا متعلق ''صحت'' مانتے ہیں اور احناف ''ثواب'' مانتے ہیں اور شوافع اور احناف کی یہ تقدیر کہاں تک صحیح ہے اور کہاں تک صحیح نہیں ہے؟ اس کو آگے بتایا جائے گا۔

## بغیر نیت اور ارادہ کے کوئی کام نہیں ہوتا

اب ان تمام چیزوں کو سامنے رکھنے کے بعد پہلے تو ہم روایت: **''إنما الأعمال بالنیات''** کے معنی پر غور کریں، روایت کا معنی یہی ہوگا کہ اعمال کا انحصار نیتوں پر ہے: یعنی عمل شرعی، جو شریعت میں معتبر ہے اس کے لئے نیت کی ضرورت ہے۔ جب عمل کا انحصار نیتوں پر ہے تو معلوم ہوا کہ بغیر نیت کے عمل یا تو ہوگا ہی نہیں یا ہوگا تو شریعت میں اس کا اعتبار نہیں ہوگا، وہ بیکار ہوگا اور '' **لاشـــیٔ** '' سمجھا جائے گا، عمل کے لئے نیت کا ہونا ضروری ہے۔ دنیا میں جتنے بھی عقلمندوں کے اعمال ہیں، وہ اختیاری عمل ہیں اور ہر عمل سے پہلے نیت ضروری ہے؛ کیوں کہ بغیر نیت کے کوئی انسان کام کرتا ہی نہیں، پاگلوں کی بات نہیں ہے اور نابالغوں کی بات نہیں ہے ہم بات کر رہے ہیں عقلمندوں کی، عقلمند کا ہر کام نیت اور اردہ کے ساتھ ہی ہوتا ہے، اگر کرسی بنانے کا ارادہ نہ کیا جاتا تو کرسی بنتی ہی نہیں، سوئی بنانے کا ارادہ نہیں کیا جاتا تو سوئی بنتی ہی نہیں، مطلب یہ ہوا کہ پہلے دل میں ارادہ ہوتا ہے تب اس کے بعد ہاتھ پاؤں کام کرنے لگتے ہیں۔

دل بادشاہ ہے، ہاتھ پاؤں رعیت ہیں، جیسے بادشاہ کے حکم سے رعایا کام کرتی ہے، ویسے ہی دل کے حکم سے ہاتھ پاؤں کام کرتے ہیں، معلوم ہوا کہ عمل کے وجود کے لئے ارادہ ضروری ہے، دنیا کا ہر چھوٹا بڑا کام ہر چھوٹی بڑی چیز بغیر نیت کے موجود ہو ہی نہیں سکتی، انسان کوئی کام بلا غرض کرتا ہی نہیں، اسی طریقہ سے اللہ تعالی بھی انسانوں کے انہی کاموں کو قبول کرتا ہے جو اس کے لئے کیا گیا ہو، جس کام میں اس کی رضا پیش نظر ہو اور اگر وہ کام بغیر اخلاص کے کیا جائے تو وہ ''هَبَآءً مَّنْثُوْرًا'' ہے، اللہ کے یہاں اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

## عمل کا حسن وقبح ظاہری صورت پر نہیں بلکہ اچھی یا بری نیت پر موقوف ہے

اس حدیث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کام کے اندر کام کی صورت کو نہیں دیکھیں گے ؛ بلکہ نیت کو دیکھا جائے گا کہ وہ نیت کیسی ہے کام چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، نیت اگر اچھی ہے تو چھوٹا کام بھی اچھا سمجھا جائے گا اور اگر کام بہت بڑا ہے، لیکن نیت خراب ہے تو بڑا کام بھی خراب سمجھا جائے گا، کام کا حسن وقبح کام کی صورت پر موقوف نہیں ہے؛ بلکہ وہ اچھی اور بری نیت پر موقوف ہے، مثلا: ایک آدمی زمزم کے پانی سے وضو کرتا ہے اور مسجد حرام کے اندر کھڑے ہو کر بالکل خانہ کعبہ کے سامنے نماز پڑھتا ہے، تو صورت کتنی اچھی ہے! لیکن نیت ہے کہ لوگ مجھے بزرگ سمجھیں، تو اس نماز کو کیا کہا جائے گا؛ چنانچہ اللہ تعالی ایسی نماز کو قبول نہیں کرتے، اسی طرح ایک وہ کسان ہے جو کھیت میں ہل جوت رہا ہے اور وہ نماز کے وقت گدلے پانی سے وضو کرتا ہے اور رومال بچھا کر نماز ادا کرنے لگ جاتا ہے، اس کی نیت ہے کہ اللہ مجھ سے راضی ہو جائے، تو صورت کتنی خراب ہے! لیکن نیت کے عمدہ ہونے کی وجہ سے اللہ اس کی نماز کو قبول فرماتے ہیں۔

### مدارِ نجات اخلاص ہے

انسان کی اصل کامیابی کا اندازہ اس کے اخلاص کے اعتبار سے لگا سکتے ہیں اگر کسی انسان کی کوئی چیز (عند اللہ) مقبول ہوتی ہے تو یہ اس کے اخلاص کی واضح دلیل ہے؛ چنانچہ اللہ رب العزت نے فرمایا: ﴿لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَكِن يَنَالُهُ التَّقْوَى مِنكُمْ﴾ (سورہ حج: ۳۷) ہرگز تمہارا خون اور گوشت اللہ کے پاس نہیں پہنچتا؛ بلکہ اللہ کے پاس تو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے؛ اسی بناء پر سید الانبیاء والاتقیا ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”اِنَّ اللّٰہَ لَا یَنْظُرُ اِلٰی صُوَرِکُمْ وَلٰکِنْ یَنْظُرُ اِلٰی اَعْمَالِکُمْ وَقُلُوْبِکُمْ“ کہ اللہ تعالی تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا کہ تم کالے ہو یا گورے بلکہ اللہ تعالی تمہارے اعمال اور قلوب کو دیکھتا ہے مزید وضاحت کے لئے آپؐ نے ارشاد فرمایا: ” لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی

عَـجَـمِيٍّ اِلَّا بِالتَّقْوٰی"، یعنی کالے کو گورے پر اور گورے کو کالے پر، عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں ہے، اگر فضیلت ہے تو تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔

## مذکورہ حدیث سے مسائل کا استنباط

اس حدیث سے بے شمار مسائل نکلتے ہیں: صورت ایک ہے نیت کے بدلنے سے حکم بدل جاتا ہے، مثلاً: ایک ہے قتل عمد اور ایک ہے قتل خطاء، جان بوجھ کر ایک آدمی نے کسی کو (مہلک آلہ سے) قتل کر دیا تو اس پر قصاص لازم ہوگا؛ کیوں کہ جان کے بدلے میں جان ہے، اور ایک آدمی شکار پر تیر چلا رہا تھا اتفاق سے وہ کسی آدمی کو لگ گیا اور وہ مر گیا، موت دونوں جگہ واقع ہوئی؛ لیکن ایک جگہ قصاص لازم ہے اور دوسری جگہ دیت لازم ہے؛ اور یہ نیت کی وجہ سے ہے: عمد میں نیت مارنے کی ہے اور خطاء میں مارنے کی نہیں ہے؛ بلکہ چوک سے لگ گیا ہے۔

اسی طرح ایک شخص اجنبی عورت سے زنا کر لیتا ہے، اس کی سزا اگر شادی شدہ ہے تو رجم ہے، نہیں تو سو کوڑے لگائیں گے، اگر اس وطی سے حمل ٹھہر جائے تو نسب ثابت نہیں ہوگا؛ کیوں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: وللعاهر الحجر. (۱) ایک شخص اندھیری رات میں (عورت کے پاس) یہ سمجھ کر گیا کہ یہ میری بیوی ہے، جب فارغ ہوا تو دیکھا کہ یہ تو اجنبی عورت ہے، اس کو وطی بالشبہ کہتے ہیں، اس میں حد نہیں ہے اور حمل ٹھہر جائے تو نسب ثابت ہوگا، دیکھیں: دونوں جگہ زنا کی صورت پائی گئی؛ لیکن نیت کی وجہ سے حکم میں فرق ہے، پہلی صورت میں اجنبی عورت سے زنا کرنے کی نیت ہے اور دوسری صورت میں ایسا نہیں ہے۔

## اچھی نیت اسی عمل میں معتبر ہے جس میں اچھا بننے کی صلاحیت ہو

یہ قید بھی ضروری ہے کہ اس کام میں اچھا بننے کی صلاحیت بھی ہو، اگر اس کام کی ذات بالکل خراب ہو، جس میں اچھا بننے کی صلاحیت نہ ہو تو تم اس کے اوپر ہزار پالش کر دو،

---

(۱) الولد للفراش وللعاهر الحجر. (صحیح مسلم ۱/۴۷۰، باب الولد للفراش وتوقی الشبهات

اچھی نیت کرو، وہ کام کبھی اچھا نہیں ہوگا، اچھی نیت سے خراب کام بھی اچھا تو ہوتا ہے؛ مگر اس وقت جب کہ اس میں اچھا بننے کی صلاحیت ہو۔

## برکت کا مدار خلاص پر ہے

اللہ تعالی اعمال کے اندر انسان کے جذبے کو دیکھ کر کے اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہے، اگر ہم خاص ٹھیٹھ لفظوں میں کہہ دیں کہ حضور کا مقصد ہے کہ عمل میں برکت نیت سے آتی ہے اچھی نیت کریں گے تو اللہ تعالی اس میں برکت دیگا اگر عمل کے اندر اچھی نیت نہیں کی تو اس میں برکت نہیں دیگا کیونکہ برکت کا مدار اخلاص پر ہے اس کو مثال میں سمجھئے اچھے درخت کا مدار ہے اچھے بیج پر، جس کا بیج اچھا ہوگا اس کا درخت اچھا ہوگا، جس کا درخت اچھا ہوگا اس پھل بھی اچھا ہوگا۔

## حدیث کا مقصد عمل کی صحت یا ثواب نہیں؛ بلکہ برکت اور عدم برکت کو بتانا ہے

یہ جو باتیں کہی جاتی ہیں شوافع صحت کو مقدر مانتے ہیں اور احناف ثواب کو مقدر مانتے ہیں، تو جاننا چاہیے کہ نہ تو شوافع کی بات صحیح ہے نہ احناف کی بات صحیح ہے، یہاں وہ بحث ہی نہیں، جو یہ حضرات کرنا چاہ رہے ہیں، یہاں تو اس سے ایک اونچی چیز اور ایک عام بات ہے، جو ہر جگہ صادق آئے، وہ بیان کرنا مقصود ہے؛ اگر شوافع کی تشریح لی جائے تو حدیث کے اندر جو ایک سمندر ہے، وہ گویا کوزہ بن جائے گا، اس کے وسیع مفہوم کو تنگ کرنا لازم آئے گا اور احناف کے مفہوم کے مطابق بھی اس کا وسیع مفہوم تنگ ہو جائے گا، یہاں وہ بات ہی نہیں ہے، جو شوافع اور احناف کر رہے ہیں۔

کیسے (ائمہ کی تقدیر درست ہوسکتی ہے؟ کیوں کہ) شوافع کی تقدیر ہے صحت۔
ظاہر ہے اس حدیث کا تعلق دنیا وآخرت دونوں سے ہوگا یا صرف کسی ایک عالم سے ہوگا۔ اگر صحت کو مقدر مانیں تو اس کا تعلق صرف دنیا کے ساتھ ہوگا؛ کیونکہ صحیح وہ ہے جس میں شرائط وفرائض کا لحاظ کیا جائے، کام کر کے آدمی بریٔ الذمہ ہو جائے، جیسے آدمی نے نماز

پڑھی اور بریٔ الذمہ ہوگیا، یہ حکم دنیوی ہے، (کیا) آخرت کے اندر کوئی کام کرنے کا ہے؟ اور (کیا) وہاں صحت کا سوال پیدا ہوگا؟ (نہیں) وہاں (صرف) ثواب کی بات ہوگی اور وہاں صحیح اور غیر صحیح کو نہیں دیکھا جائے گا، ثواب حکم اخروی ہے، شوافع صحت کی تقدیر کو مانتے ہیں تو یہ حدیث خاص ہوجائے گی حکم دنیوی کے ساتھ، جب کہ آپ ﷺ نے اس حدیث میں حکم اخروی بھی بیان فرمایا ہے۔ اس حدیث میں حکم اخروی بھی ہے، جیسے: "**فمن کانت ھجرته الخ**" یعنی جو اللہ و رسول کے لئے ہجرت کرے تو وہ مقبول ہے اور جب وہ مقبول ہے تو ثواب بھی ملے گا۔

دوسری بات احناف کی تقدیر کو مانیں تو اب یہاں بھی وسیع مفہوم کو تنگ کرنا لازم آئے گا؛ کیوں کہ ثواب کا تعلق آخرت سے ہے؛ حالانکہ اس صورت میں گناہ کا بھی ذکر آرہا ہے اور عقاب کا بھی ذکر آرہا ہے۔ ہجرت کرنا دنیا کے لئے، ہجرت کرنا عورت سے شادی کرنے کے لئے تو یہ حکم دنیوی ہے، معلوم ہوا کہ نہ ثواب بتانا (مقصد) ہے، نہ صحت بتانا؛ بلکہ اعمال کی برکت اور عدم برکت کو بتانا ہے یہ پہلے جملے (**اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَاتِ**) کا مطلب ہوگا۔

## اِنَّمَا لِاِمْرِءٍ مَّانَوٰی کی تشریح

یہ دوسرا جملہ بھی بڑا معنی خیز ہے "**اِنَّمَا**" کی تحقیق تو ہوگئی، "**لِاِمْرِءٍ**" لام کے بعد الف وصلی ہے۔ "**مَانَوٰی**": "**مَا**" عام ہے، ہر چیز کو شامل ہے، اس جملہ کا ترجمہ ہے: انسان کو وہی ملے گا، جس کی اس نے نیت کی ہے، اس جملے کی تشریح میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے مفصل کلام کیا ہے اور مختلف توجیہات کی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

(۱) بعض حضرات کہتے ہیں کہ "**اِنَّمَا لِاِمْرِءٍ مَّا نَوٰی**"، کا وہی مطلب ہے، جو "**اِنَّمَا الْاَعْمَالُ**"، کا ہے؛ گویا کہ یہ جملہ پہلے جملے کی تاکید ہے، پہلے جملے میں جو بتایا گیا کہ عمل کا تعلق نیت سے ہے، یہ دوسرا جملہ بھی وہی بات بتلا رہا ہے کہ انسان جو نیت

کرتا ہے، اسی نیت کے مطابق اس کو بدلہ دیا جائے گا۔(۱)

لیکن محققین نے ''التأسیس خیر من التاکید '' کی رو سے اس توجیہ کو رد کر دیا ہے، یعنی جہاں نئے معنی (تاسیس) مراد ہو سکتے ہوں تو وہ تاکید سے بہتر ہے، محققین کہتے ہیں کہ اس (جملہ) کے نئے معنی نکل سکتے ہیں۔(۲)

## اِنَّمَا لِاِمْرِءٍ مَّانَوٰی کے مختلف معانی

تاسیس (نئے معنی) کی مختلف توجیہ کی گئی ہے (۱) پہلے جملے میں بتلایا گیا کہ عمل کا ربط نیت سے ہے اور اس جملہ (اِنَّمَا لِاِمْرِءٍ مَّانَوٰی) میں عامل کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ تم جو نیت کرو گے (۳) وہی تمہارے حصے میں آئے گا: یعنی وہاں عمل کا بیان تھا اور یہاں عامل کا بیان ہے۔ عامل کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ جب عمل کا مدار نیت پر ہے تو جیسی تم نیت کرو گے، ویسی چیز تمہارے حصے میں آئے گی: اچھی نیت کرو گے، اچھی چیز آئے گی، خراب چیز کی نیت کرو گے تو خراب چیز تمہارے حصے میں آئے گی۔

(۲) امام نوویؒ دونوں میں فرق بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پہلے جملے میں نیت کا بیان ہے کہ عمل کے لئے نیت ضروری ہے اور دوسرے جملے میں تعین نیت کا بیان ہے: کہتے ہیں کہ اس دوسرے جملے میں بتلایا گیا ہے کہ اگر تم نیت کرتے ہو تو مطلقاً نہیں کرنا؛ بلکہ نیت کی تعیین بھی کر دینا اور امام نوویؒ نے مثال دی ہے کہ مثلاً: کسی آدمی کے اوپر ظہر کی نماز باقی ہے تو جب وہ ظہر کی نماز قضاء کرے گا تو کہے گا کہ میں '' ظہر کی نماز کی قضاء'' کرتا ہوں،

---

(۱) تکون هذه الجملة تاكيدا للجملة الأولى فذكر الحكم بالأولى (عمدۃ القاری ۱/۵۱) وأكده بالثانية تنبيها على شرف الإخلاص، قال القرطبي فيه تحقيق، الاشتراط النية والإخلاص في الأعمال فجنح إلى أنها مؤكدة، وقال غيره: بل تفيد غير ما أفادته الأولى، لأن الأولى نبهت على أن العمل يتبع النية ويصاحبها، فيرتب الحكم على ذلك. (فتح الباری ۱/۱۸)

(۲) وحمله على التاسيس أولى لإفادته معنى لم يكن في الأول. (عمدۃ القاری ۱/۵۵، زکریا بکڈپو)

(۳) والثانية أفادت أن العامل لا يحصل له إلا ما نواه. (فتح الباری ۱/۱۸)

صرف قضاء نہ بولے؛ بلکہ اس کے ساتھ ظہر کا لفظ بھی بولے اور ظہر کی تعیین بھی کر دے۔(۱)

خلاصہ یہ کہ ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَاتِ'' سے (مطلق) نیت کو بتلایا ہے اور ''اِنَّمَا لِاِمْرِءٍ مَّانَوٰی'' سے تعیین نیت کو بتلایا گیا ہے۔

(۳) حافظ ابن حجر عسقلانیؒ علامہ سمعانیؒ کے حوالے سے ایک تیسری توجیہ بیان کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ حدیث کا مقصد یہ ہے کہ جو کام عادۃً کیا جاتا ہے اس کو اگر عبادت بنانا ہو تو نیت کرلو، وہ عادت عبادت بن جائے گی، مثلا: کھانا انسان عادۃً کھاتا ہے؛ لیکن اگر اس کھانے میں وہ نیت کرلے کہ کھانے سے قوت پیدا ہوگی تو عبادت کریں گے، تو یہ کھانا بھی عبادت بن جائے گا، رات میں طالب علم سو جائے، نیت یہ کرے کہ سونے کے بعد تکان اتر جائے گی، تو اچھی طرح سے پڑھوں گا، تو یہ سونا بھی عبادت بن جائے گا۔(۲)

(۴) بعض حضرات کہتے ہیں کہ ''اِنَّمَا لِاِمْرِءٍ مَّا نَوٰی'' میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کو وہی ملے گا، جو اس نے خود نیت کی ہے: یعنی اپنی نیت کی چیز اس کو ملے گی اگر اس کی طرف سے کوئی دوسرا شخص نیت کرے تو دوسرے کی نیت پہ کچھ نہیں ملے گا وہی ملے گا جو تم نے نیت کی ہے، تمہاری طرف سے کوئی دوسرا نیت نہیں کرسکتا کیوں کہ نیت میں نیابت نہیں چلتی، نیت خود کام کرنے والے کو کرنی پڑتی ہے: ﴿وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَى﴾ (سورہ نجم:۳۹)

(۵) امام نوویؒ کہتے ہیں کہ ایک ایک کام میں کئی نیت کرلو تو سب کا الگ الگ ثواب ملے گا، انسان کو وہ تمام چیزیں ملیں گی، جن چیزوں کی اس نے نیت کی ہے: مثلاً نماز

---

(۱) وقال النووي: أفادت الجملة الثانية اشتراط تعيين المنوي كمن عليه صلاة فائتة لا يكفيه أن ينوي الفائتة فقط، حتى يعينها ظهرا مثلا أو عصرا. (فتح الباری ۱/۱۹-عمدۃ القاری ۱/۵۶)

(۲) وقال ابن السمعاني في ''أماليه'' أفادت أن الأعمال الخارجة عن العبادة لا تفيد الثواب إلا إذا نوى بها فاعلها القربة كالأكل إذا نوى به القوة على الطعام. (فتح الباری ۱/۱۹، مکتبہ دار السلام، الریاض-عمدۃ القاری ۱/۵۶، زکریا بکڈپو)

پڑھنے کے لئے نکلو، تو ایک نیت یہ کرلو کہ نماز پڑھنے نکلوں گا تو ایک ثواب ملے گا اور ایک ارادہ یہ کیا کہ مسجد جاؤں گا، مسجد میں جانا گویا کہ اللہ کے گھر کی زیارت ہے، الگ ثواب ملے گا، نیت کرلو کہ وہاں نیک لوگوں کی صحبت ہوگی تو اس کا بھی ثواب ملے گا۔(۱)

## حدیث کی ''ترجمۃ الباب'' سے مطابقت

حدیث میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ امام بخاری نے پوری حدیث نقل نہیں کی، **فمن كانت هجرته إلى الله ورسوله فهجرته إلى الله ورسوله** یہ ٹکڑا حدیث میں نہیں ہے، یہاں قابل توجہ امر یہ ہے کہ اس حدیث میں وحی اور بدء وحی کا ذکر نہیں ہے اور نہ ہی اس حدیث کا **كيف كان بدء الوحي** سے کوئی ربط سمجھ میں آتا ہے اور نہ ہی **إنا أوحينا** سے کوئی تعلق سمجھ میں آرہا ہے، تو پھر امام بخاری نے اس کو یہاں کیوں ذکر کیا ہے؟ اس کی مختلف توجیہ کی گئی ہے:

(۱) بعض حضرات نے کہا امام بخاری نے یہ روایت بطور خطبہ درج کی ہے؛ چونکہ حضرت عمرؓ نے اس کو منبر پر خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا؛ اس لیے امام بخاری نے اس کو اپنی کتاب کا خطبہ بنادیا۔(۲)

لیکن یہ جواب تسلی بخش نہیں ہے؛ کیوں کہ اگر خطبہ بنانا مقصود ہوتا تو اس حدیث کو باب سے پہلے ذکر کرتے؛ اس لیے کہ کتاب تو باب کیف کان بدء الوحي سے شروع ہوئی، یہ کون سا طریقہ ہے کہ کتاب شروع کردی جائے اور خطبہ بعد میں لایا جائے۔

(۲) بعض حضرات نے کہا امام بخاری نے دراصل تصحیح نیت کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں اور ان کا منشأ یہ ہے کہ پڑھنے والوں کو شروع ہی میں اپنی نیت درست

---

(۱) تقریر بخاری شریف از شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہ ۱/۴۷

(۲) تقریر بخاری ۱/۷۷

کر لینی چاہیے۔(۱)

لیکن اس بات میں بھی نظر ہے، اصلاحِ نیت اور تصحیح نیت کی طرف توجہ دلانے کے لیے ضروری تھا کہ باب سے پہلے اس کو ذکر کرتے، جس طرح مشکوۃ شریف میں کتاب الایمان کے شروع ہونے سے پہلے **إنما الأعمال بالنیات** والی حدیث لائی گئی ہے۔

(۳) حدیث میں ہجرت کا ذکر ہے اور ترجمہ میں بدء الوحی کا ذکر ہے؛ اس لیے ہجرت کے معنی میں غور کرتے ہیں، ہجرت کے معنی ہیں ایک مکان سے دوسرے مکان کی طرف منتقل ہونا اور شرعی معنی ہیں معصیت سے طاعت کی طرف منتقل ہونا، **المهاجر من هاجر ما نهى الله عنه** (۲) اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے منع فرمایا ان کو چھوڑ دینا ہجرت ہے اور چھوڑنے والا مہاجر ہے، معلوم ہوا کہ ہجرت دو ہیں: ایک ہجرت وہ ہے جو آپ نے اپنے مکان سے غار حرا کی طرف کی ہے، جس کا سلسلہ تقریبا چھ ماہ تک جاری رہا، آپ عبادت کے لیے اور یادِ الٰہی میں مصروف رہنے کے لیے اپنے گھر بار چھوڑ کر غار حرا تشریف لے جاتے تھے، دوسری ہجرت وہ ہے جو آپ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ کی طرف کی ہے۔

پہلی ہجرت نزول وحی اور بدایت وحی کا ذریعہ بنی اور دوسری ہجرت ظہور اور فروع وحی کا ذریعہ بنی، یہاں امام بخاری نے ترجمہ بدایت وحی کا قائم کیا ہے اور ہجرت کی حدیث نقل کی ہے، اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے بدایت وحی کا ذریعہ وہ ہجرت ہے جو آپ نے اپنے گھر سے غار حرا کی طرف کی، اب مناسبت واضح ہوگئی؛ کیوں کہ بدایت وحی کا ترجمہ قائم کیا گیا ہے اور اس میں ہجرت کی حدیث ذکر کی ہے جو بدء الوحی کا سبب ہے۔(۳)

---

(۱) تقریر بخاری ۱/۷۷
(۲) صحیح بخاری، رقم: ۱۰، کتاب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده
(۳) امداد الباری ۲/۴۳۲

(۴) بعض حضرات نے کہا اس حدیث کو ترجمۃ الباب کے پہلے جز کیف کان بدء الوحی سے مناسبت نہیں؛ بلکہ دوسرے جز یعنی آیت قرآنی إنا أوحینا إلی آخرہ سے مناسبت ہے، مناسبت اس طرح ہے کہ امام بخاریؒ نے اس حدیث کے ذریعہ ایک ایسی وحی کی مثال پیش کی ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام کو کی گئی اور وہ ہے تصحیح نیت کی وحی جس کی تمام انبیاء کرام کو تلقین کی گئی۔(۱)

(۵) ایک وجہ یہ بیان کی گئی کہ یہ کتاب وحی السنہ کو بیان کرنے کے لیے وضع کی گئی ہے؛ اس لیے امام بخاریؒ نے بدء الوحی سے اس کی ابتدا کی، پھر چونکہ وحی میں اعمال شرعیہ کا بیان ہے؛ اس لیے حدیث اعمال سے اس کا آغاز فرمایا۔(۲)

(۶) ایک توجیہ یہ گئی کہ نبوت وہبی ہے، کسب کا اس میں کوئی دخل نہیں؛ لیکن جس شخص کو نبوت عطا ہوتی ہے اس میں کمالات اور صفات اعلیٰ درجہ کے ہونے چاہیے، صفات اور کمالات میں سب سے بڑی صفت اور سب سے بڑا کمال اخلاص ہے جو رسول اللہ ﷺ میں نہایت اعلیٰ درجہ کا تھا، اس طرح امام بخاری روایت کو لاکر دراصل یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نبوت اور اخلاص میں قریبی اور گہرا ربط ہے، جس آدمی کو نبی بنایا جاتا ہے اس میں اخلاص بہت اعلیٰ درجہ کا ہوا کرتا ہے، اس طرح حدیث کا ترجمۃ الباب کے ساتھ ربط واضح ہوجاتا ہے۔(۳)

---

(۱) امداد الباری ۲/۴۳۲

(۲) فتح الباری ۱/۱۱

(۳) امداد الباری ۲/۴۲۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# بخاری شریف کی آخری حدیث

بَابُ قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالَى: ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ﴾ وأنَّ أعْمَالَ بَنِيْ آدَمَ وقَوْلَهُمْ يُوْزَنُ، وَقَالَ مُجَاهِدٌ: اَلْقِسْطَاسُ: اَلْعَدْلُ بِالرُّومِيَّةِ، وَيُقَالُ: اَلْقِسْطُ: مَصْدَرُ الْمُقْسِطِ: وَهُوَ الْعَادِلُ، وَأَمَّا الْقَاسِطُ فَهُوَ الْجَائِرُ.

حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ إِشْكَابٍ، قَالَ: حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فُضَيْلٍ، عَنْ عُمَارَةَ بْنِ الْقَعْقَاعِ، عَنْ أَبِي زُرْعَةَ، عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ – رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ – قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ إِلَى الرَّحْمٰنِ، خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ، ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ: ''سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيمِ''.

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اور ہم قیامت کے دن میزان عدل (انصاف کی ترازو) قائم کریں گے اور بلا شبہ بنی آدم کے اعمال اور ان کے اقوال وزن کئے جائیں گے، مجاہد نے فرمایا کہ قسطاس بمعنی عدل ہے، رومی زبان میں اور ''قسط'' مقسط کے مصدر کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے بمعنی عادل اور قاسط بمعنی ظالم ہیں۔

ہم سے احمد بن اشکاب نے حدیث بیان کی، ان سے محمد بن فضیل نے حدیث بیان کی، ان سے عمارہ بن قعقاع نے، ان سے ابوزرعہ نے اور ان سے ابوہریرہ نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: دو کلمے جو بہت رحم کرنے والے اللہ کی بارگاہ میں پسندیدہ ہیں، زبان پر بہت ہلکے، لیکن (قیامت کے دن) ترازو میں بہت بھاری ثابت ہوں گے اور وہ یہ ہیں: سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْم.

## تمہید

بخاری شریف کا یہ آخری عنوان ہے اور آخری حدیث ہے دراصل یہ عنوان اور یہ حدیث توحید کا عنوان ہے اور توحید کی حدیث ہے، امام بخاری نے اپنی کتاب کا خاتمہ کتاب التوحید پر کیا ہے اور امام بخاری کا مقصد ہے توحید کے مسئلے میں اہل سنت کی تائید اور اہل بدعت کی تردید (کرنا) امام بخاری اخیر کتاب میں یہ باب ذکر کر کے پڑھنے والوں کو بتانا چاہتے ہیں کہ جن کا عقیدہ توحید ٹھیک ہوگا، ان کا دین ٹھیک ہوگا، جن کی توحید ہی خراب ہوگی، ان کا دین سراسر خراب ہوگا؛ اس لئے امام بخاریؒ کہنا چاہتے ہیں کہ جو کچھ پڑھا ہے، وہ محفوظ تب ہی رہے گا، جب تمہاری توحید محفوظ رہے گی، توحید بگڑی سب پڑھا پڑھایا بگڑا، سارا دین بگڑ گیا، یہ ترجمۃ الباب اور حدیث سمجھنے کے لئے تھوڑی سی بات ذہن میں رکھنی ہوگی پھر ان شاء اللہ امام بخاری کا یہ باب اور ان کی حدیث پوری طرح سمجھ میں آجائے گی۔

## توحید کی اقسام

توحید کی دو قسمیں ہیں (۱) توحید ذاتی (۲) توحید فعلی۔ توحید کا تعلق اللہ کی ذات سے بھی ہے اور توحید کا تعلق اللہ کے فعل سے بھی ہے اس لئے دونوں توحید ٹھیک رہنی چاہئے، ذاتی بھی ٹھیک رہے اور فعلی بھی ٹھیک رہے۔

## (۱) توحید ذاتی

توحید ذاتی کا مطلب ہوتا ہے کہ اللہ کی ذات نرالی ہے اور بے مثال ہے ''وحدہ لاشریک'' ہے، اس کی ذات کی نہ کوئی مثال ہے، نہ کوئی نظیر ہے، وہ اپنی ذات میں یکتا ہے۔

## (۲) توحید فعلی

توحید فعلی کا مطلب ہے کہ اللہ کا کام بھی سب سے نرالا ہے، اس کا کام بھی بے

نظیر و بے مثال ہے، جیسے اس کی ذات کی کوئی مثال نہیں، اسی طرح اس کے فعل کی بھی کوئی مثال نہیں ہے، وہ ذات میں وحدہ لاشریک ہے، اس کا فعل بھی وحدہ لاشریک ہے، بس یہی اصل مقصد ہے، اللہ تعالیٰ کے بعض کام ایسے ہیں جن کی توحید روزِ روشن کی طرح بالکل واضح اورعیاں ہے، وہ خود روشن ہیں، انہیں روشن کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن کچھ خرد ماغ، کچھ کج دماغ اور کچھ غبی ایسے ہیں جنہوں نے اللہ کی توحید کے اندر کچھ نقص نکالا ہے، یہ ان کی انتہائی غباوت اوران کی انتہائی خرد ماغی کی دلیل ہے، اللہ کے بعض افعال ایسے ظاہر و باہر اور ایسے نمایاں ہیں کہ غبی سے غبی اور خر سے خر دماغ، کند ذہن سے کند ذہن، کوئی بھی انسان اس کی توحید کے اندر کوئی شوشہ نکال ہی نہیں سکتا، ایسے واضح ہیں کہ دانا اور ناداں سبھی اس کو جانتے ہیں، کچھ کہنے کی گنجائش نہیں۔

## حضرت ابراہیمؑ کا نمرود کے ساتھ مناظرہ

حضرت ابراہیم کا مناظرہ جو نمرود کے ساتھ ہوا ہے، قرآن کریم میں اس کا تذکرہ ہے، نمرود نے حضرت ابراہیمؑ سے دریافت کیا کہ آپ جس خدا کی دعوت دیتے ہیں ذرا اس کا تعارف تو کیجئے، کیا کیا گُن اس میں ہے؟ کیا خوبی اس میں ہے؟ ذرا اس پر روشنی تو ڈالئے، حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ ہمارے رب میں یہ گُن ہے کہ وہ مارتا ہے اور جلاتا ہے: ﴿يُحْيِ وَيُمِيتُ﴾ (البقرۃ:۲۵۸) وہ زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے؛ یہاں کچھ شبہ کی بالکل گنجائش نہیں ہے؛ مگر نمرود خرد ماغ تھا؛ کیوں کہ یہ خدا سے کٹا ہوا تھا؛ اس لئے عقل سے بھی کٹا ہوا ہے، جو خدا سے کٹا ہے، وہ کبھی دانا نہیں ہوسکتا۔ وہ کہتا ہے جو کام تمہارا خدا کرتا ہے، وہ تو میں بھی کرتا ہوں؛ چنانچہ اس نے دو قیدی کو بلایا اور ابراہیمؑ کے سامنے ایک کو رہا کر دیا اور دوسرے قیدی کو تلوار سے قتل کر دیا اور کہا کہ دیکھو! یہ کام تو میں بھی کرسکتا ہوں، زندہ کرنے اور مارنے کی طاقت تو میرے اندر بھی ہے۔

## احیاء اور اماتت کی حقیقت

عقلمندوں کا کام یہ ہے کہ ﴿وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا﴾ (الفرقان:۶۳) چونکہ ابراہیمؑ الجھ سکتے تھے کہ تو تو دعویٰ کرتا ہے کہ میں خدا ہوں جبکہ تجھے احیاء اور اماتت کی حقیقت بھی معلوم نہیں، ارے احیاء کس کو کہتے ہیں؟ کسی بے جان کے اندر جان ڈال دینا یہ احیاء ہے: یعنی مردہ کو زندہ کر دینا، یہ ہے احیاء۔ اور اماتت کے معنی کیا ہیں ؟ کسی زندہ سے زندگی کو چھین لینا: یعنی زندہ کو مار دینا۔ بیوقوف تو نے کیا کیا؟ تو نے ایک قیدی کو رہا کر دیا، وہ تو پہلے سے زندہ تھا، کیا تو نے اس کو زندگی دی ہے؟ ارے تو نے تو اس زندہ کو معاف کر دیا، معاف کرنا اور چیز ہے اور زندہ کرنا اور چیز ہے، تو اتنا بے عقل ہے کہ تجھے معاف کرنے اور زندہ کرنے کی حقیقت بھی معلوم نہیں، ایک مجرم کو تو نے قتل کر دیا، اس میں تیرا کیا کمال ہوا، کمال تو پھر تلوار کا ہوا، تلوار نے مارا ہے، تو نے نہیں مارا، کاٹا ہے تلوار نے، تو نے نہیں کاٹا، اس میں تیری کیا خصوصیت ہے؟ کہ تم دعویٰ کرتے ہو۔ یہ تو جو انسان بھی تلوار چلاتا ہے، وہ گردن کو کاٹ سکتا ہے، پاگل بھی ایسا کام کر سکتا ہے، پھر تم میں اور پاگل میں کیا امتیاز ہوا۔

## قدرت کا مطلب

اماتت کا تو مطلب یہ ہونا چاہئے کہ تم کو کسی زندہ کے مارنے کی قدرت ہو اور جانتے ہو قدرت کس کو کہا جاتا ہے؟ جس کو دونوں کام کے اوپر طاقت ہو، ایک ہی چیز سے وہ زندہ بھی کر سکتا ہو، اسی سے وہ مار بھی سکتا ہو، مثلاً: تلوار چلانا، اگر تو قادر ہے، تیرے اندر اماتت کی شان ہے تو ذرا تو تلوار چلا کر ارادہ کر کہ نہ مرے، دیکھیں کیسے نہیں مرتا ہے، اس کو تو مرنا ہی ہے، معلوم ہوا کہ تیرے اندر اماتت کی قدرت اس وقت ہوتی کہ تو تلوار چلاتا اور ارادہ کرتا کہ (جس پر تلوار چلائی گئی ہے وہ) نہ مرے تو اگر تیرے سوچنے

سے نہ مرتا،تو یہ اماتت ( کی قدرت ہوتی ) یعنی جس تلوار سے تم مار سکتے ہو اسی تلوار سے اگر تم جِلا سکتے ہو، تبھی اس کو قدرت کہا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالی کی کتابِ حکمت تو یہی سب حکمت کی باتیں بیان کرتی ہے، دیکھئے اللہ کی قدرت ، آگ کے اندر احراق کا مادہ ( تاثیر ) ہے، جلانے کا مادہ ہے اور اللہ بہت سوں کو آگ سے جلاتا ہے؛ لیکن اللہ کی قدرت دیکھئے اللہ جب چاہتا ہے تو کسی کے لئے ( آگ کو ) باغ بنا دیتا ہے، اسی جلانے والی آگ کو کسی کے لئے زندگی کا باعث بنا دیتا ہے؛ چنانچہ نمرود نے ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا تھا؛ لیکن اللہ نے اس آگ کو ابراہیمؑ کے لئے گل گلزار بنا دیا، دیکھئے ایک ہی آگ سے اللہ جلا بھی رہا ہے اور جلانے سے بچا بھی رہا ہے؛ اماتت ( کی قدرت ) تو اس کو کہا جاتا ہے کہ تمہارے اندر دونوں باتوں کی طاقت ہو،تمہارے اندر یہ طاقت ہے کہ تم تلوار چلاؤ اور ارادہ کرو کہ نہ مرے؛ اگر نہیں مرتا ہے، تب ہم خدا مانیں گے؛ لیکن ابراہیمؑ اس احمق سے کیا الجھتے ؛ کیوں کہ اللہ فرماتے ہیں: ﴿وَاِذَامَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا، وَاِذَاخَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا﴾ (الفرقان: ۶۳) جواب جاہلاں باشد خموشی: جاہلوں کا جواب یہ ہے کہ خاموش رہے۔

اچھا چلو، اب سنو میرے اللہ کی صفت کیا ہے؟ اللہ کیا کرتا ہے؟ فرمایا کہ میرا خدا مشرق سے سورج کو نکالتا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَأْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ﴾ (البقرۃ:۲۵۸) نمرود! اگر تو خدا ہے تو مغرب سے سورج کو نکال دے،تو وہ لاجواب ہو گیا، اِس میں اللہ کی ایسی قدرت ہے،جس میں جاہل سے جاہل انسان اور عالم سے عالم انسان کوئی دخل ہی نہیں دے سکتا کہ یہاں سب کو ہتھیار رکھ دینے پڑتے ہیں؛ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ سورج تک ہاتھ ( قدرت ) خدا کے سوا کسی کا نہیں پہنچ سکتا، نکالنا، ڈوبونا اللہ کا کام ہے، کوئی دوسرا اس میں کچھ کر ہی نہیں سکتا ، جب ابراہیمؑ نے یہ کہا،تو منہ تکتا رہ گیا: ﴿فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ﴾ (البقرۃ:۲۵۸) دیکھئے یہ اللہ کا فعل ہے، یہ کونسا فعل ہے؟ اللہ کی توحید فعلی ہے، آفتاب کو مشرق سے نکالنا اور مغرب میں ڈبونا، یہ صرف

اللہ کا کام ہے؛ یہ توحید فعلی ہے۔

## ایک اہم بات

ایک کام کی بات یہ ہے کہ حضرت تھانویؒ نے (اس آیت کی شرح میں) فرمایا کہ نمرود بات ٹالنے کے لئے یہ کہہ سکتا تھا کہ ابراہیمؑ اگر میں مغرب سے نہیں نکال سکتا ہوں، تو آج تو ہی اپنے خدا سے کہہ دے کہ مغرب سے سورج کو نکال دے، یہ کہہ کر ٹال سکتا تھا، اب یا تو اس کے ذہن میں بات نہیں آئی؛ کیونکہ گدھا تھا، خر دماغ تھا یا واقعی ذہن میں بات آئی؛ لیکن اس نے یہ بات نہیں کہی؛ کیوں کہ نمرود زبان سے تو خدا کا انکار کرتا تھا، زبان سے ابراہیمؑ کی رسالت کا منکر تھا؛ لیکن اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ سچا رسول ہے، اس کا خدا سچا ہے، زبان سے انکار کیا: ﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ﴾ (النمل:۱۴) زبان سے انکار کر رہا ہے؛ مگر دل یقین کر رہا ہے، فرعون کے بارے میں بھی یہی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: فرعون تو نے خدا کو جان لیا؛ لیکن تو زبان سے اقرار نہیں کرنا چاہتا، اللہ کوئی ڈھکی ہوئی چیز تو نہیں، رسالت کوئی ڈھکی چیز نہیں ہے، اللہ تو پوری وضاحت کے ساتھ نبیوں کو بھیجتا ہے، نمرود نے سوچا کہ یہ تو سچا نبی ہے، اگر میں نے کہہ دیا کہ تم اپنے خدا سے کہو کہ مغرب سے سورج نکال دے اور یقیناً نکال دے گا تو جتنے میرے پوجنے والے ہیں سب میرے مخالف ہو جائیں گے، سب اس کے ساتھ چلے جائیں گے، میں تنہا رہ جاؤں گا اس کا دل یقین کر رہا تھا اور شہادت دے رہا تھا کہ اگر یہ خدا سے کہہ دے گا تو خدا ایسا ضرور کر دے گا اور پھر میرا حال کیا ہوگا؟ جو مجھے ماننے والے ہیں، کٹ کر ان کے ساتھ چلے جائیں گے(۱) اللہ بعض وقت میں اللہ والوں کے ذہن میں ایسا جواب دیتا ہے کہ منکر لاجواب ہو جاتا ہے، اس کو جواب نہیں بنتا، حضرت ابراہیمؑ نے یہی ''لاجواب'' جواب دیا۔

(۱) بیان القرآن، ص:۱۵۴، تاج پبلیکیشنز دہلی

## حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی حاضر جوابی کا واقعہ

ہمارے اکابر میں بہت سے ایسے لوگ گزرے ہیں جو حاضر دماغ تھے چنانچہ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے بارے میں بہت مشہور تھا کہ بہت حاضر جواب تھے، کوئی سائل (اعتراض کرنے والا) ان کے سامنے ٹک نہیں سکتا تھا، لوہا ماننا پڑتا تھا ہتھیار ڈالنے پڑتے تھے۔

ایک لطیفہ کی بات یہ ہے کہ ایک سائل آیا، اس نے شاہ اسماعیل شہیدؒ سے سوال کیا کہ جی مولانا آپ لوگ ڈارھی کی بڑی حمایت کرتے ہیں کہ ڈارھی رکھو، ڈاڑھی رکھو، ڈاڑھی تو فطرت کے خلاف ہے، ڈاڑھی اگر فطری چیز ہوتی تو ہر بچہ ماں کے پیٹ سے ڈاڑھی لے کر نکلتا؛ لیکن آپ نے کسی بچے کو دیکھا کہ ڈاڑھی ماں کے پیٹ سے لے کر آیا ہو، اگر ڈاڑھی فطری چیز ہوتی تو اول پیدائش کے وقت سے ڈاڑھی اس کے چہرے پر ہوتی، ڈاڑھی تو بہت دنوں کے بعد اگتی ہے؛ معلوم ہوا کہ یہ فطری چیز نہیں ہے، یہ عارضی چیز ہے؛ لہذا اس کا اتنا ڈھنڈورا کیوں پیٹتے ہو؟ یہ کہنے کا مطلب تھا کہ ڈاڑھی منڈانا فطرت ہے، ڈاڑھی رکھنا فطرت کے خلاف ہے۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا: ٹھیک ہے، میں ایک بات تم سے پوچھتا ہوں کہ یہ دانت بھی تو فطرت کے خلاف ہیں، انسان جب پیدا ہوتا ہے تو کیا دانت لے کر آتا ہے، (نہیں) بے دانت کے آتا ہے، سال دو سال کے بعد دانت ہوتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ دانت فطرت کے خلاف ہیں، تو تم دانت توڑ لو، میں ڈاڑھی منڈاتا ہوں۔ اس کا کوئی جواب نہیں تھا، یہ ہے لاجواب کرنے والا جواب، یہ مسکت جواب تھا، اللہ تعالی اپنے نیک بندوں کو ایسے جواب القاء کرتے ہیں۔

حضرت مولانا سید احمد شہیدؒ سائل کا سوال اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کا جواب سن رہے تھے، حضرت شاہ صاحبؒ نے جواب دیا تو سید احمد شہیدؒ نے فرمایا: واہ رے مولوی اسماعیل! تو نے تو دندان شکن جواب دیا، دانت توڑنے والا جواب دیا، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ

السلام نے ایسا جواب دیا کہ نمرود خاموش ہو گیا۔

## ﴿و نضع﴾ سے توحید فعلی کا استنباط

امام بخاریؒ نے آخری عنوان (کتاب کے آخری باب) میں قرآن کریم کی جو آیت نقل کی ہے، اس آیت کا پہلا لفظ توحید فعلی (پر دلالت کر رہا) ہے؛ آیت کے اس ٹکڑے (وَنَضَعُ) میں غور کیا جائے، ہر عربی پڑھنے والا جانتا ہے کہ ﴿نَضَعُ﴾ متکلم کا صیغہ ہے، اللہ دعویٰ کرتے ہیں کہ میں رکھوں گا، رکھنے کی نسبت اللہ نے اپنی طرف کی ہے اور مطلب یہ ہے کہ رکھنے کی جو چیز میں کہہ رہا ہوں، میرے سوا کوئی اور نہیں رکھ سکتا، بس یہ رکھنا میرا ہی کام ہے، میرے سوا کسی کا کام نہیں۔ دنیا میں دستور ہے کہ بڑے لوگ چھوٹا موٹا کام، چھوٹے لوگوں سے کرواتے ہیں؛ لیکن جو بڑا کام ہوتا ہے، جو عام انسان نہیں کر سکتا، وہ کام پھر بادشاہ اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے کہ میں ہی انجام دے سکتا ہوں، اس کے علاوہ کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔

یہاں بھی اللہ نے فرمایا: ﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ﴾ کہ میزان عدل ہم ہی رکھیں گے، میرے سوا کسی اور میں رکھنے کی طاقت نہیں ہے، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ سرور انبیا ﷺ کی بھی طاقت نہیں ہے، فرشتوں کی بھی طاقت نہیں ہے، تمام انبیاء کی بھی طاقت نہیں ہے کسی کی بھی طاقت نہیں ہے، میزان عدل رکھنا صرف میرا کام ہے۔ امام بخاریؒ توحید کے ذیل میں یہ آیت لا کر توحید فعلی بتانا چاہتے ہیں ہے۔

## میزان عدل کی کیفیت

میزان عدل جو کہ قیامت کے روز رکھا جائے گا، اس میزان عمل کو کسی کا ہاتھ اٹھا بھی نہیں سکتا، سارے انسان مل کر اس میزان عمل کو اٹھانا بھی چاہیں تو نہیں اٹھا سکتے؛ کیونکہ حاکم نے مستدرک میں حضرت سلمانؓ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے روز جو میزان عمل رکھا جائے گا، وہ لمبا چوڑا ہوگا، وہ

اتنا بڑا ہوگا کہ آسمان وزمین کے درمیان کی ساری چیزیں بھی رکھ دیں تو سب کم ہو جائیں گی؛ تو اتنے بڑے میزان کے اٹھانے کی کس کے اندر طاقت ہے؟ جس میں آسمان وزمین بھی سما جائیں (۱) معلوم یہ ہوا کہ یہ کام تو صرف اللہ وحدہ لاشریک ہی کرے گا، جیسے وہ (اپنی ذات میں) واحد ہے، ویسے ہی وہ اپنے کام کے اندر بھی واحد ہے، جیسے اس کی ذات کی مثال نہیں ہے، اس کے وضع کی بھی مثال نہیں ہوسکتی ہے، جیسے وہ اپنی ذات میں واحد ہے ویسے ہی وضع میزان میں بھی وحدہ لاشریک ہے۔

## اللہ کا جزاء وسزا میں یکتا ہونا

قرآن میں بڑے نکات ہیں، کیوں کہ رب العالمین کا کلام ہے، اس میں توحید کی اور بھی جھلکیاں نظر آرہی ہیں، جیسے: جب اللہ کوئی کام اپنے ہاتھ میں لیں، کسی کا کیس اپنے ہاتھ میں لیں کہ میں اس کو نمٹاؤں گا، اب سوچئے مجرم کا کیا حال ہوگا؟ اب تو اس کا خون پانی ہوگا کہ رب العالمین نے اپنے ہاتھ میں یہ کیس لے لیا ہے، اب تو وہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردے گا، اس میں کوئی ملاوٹ کی گنجائش نہیں ہوسکتی وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے، وہ تو سب کو الگ الگ کردے گا، اب تو مجرم کو یہ سوچنا پڑے گا کہ اللہ تعالی جب سزادے گا تو ایسی سزادے گا کہ کوئی دوسرا ویسی سزادے ہی نہیں سکتا، تو دیکھئے یہاں بھی توحید جھلک رہی ہے اور اس میں نیک لوگوں کے لئے بڑی راحت، اور امید کا سامان ہے، نیک لوگ کیا سوچیں گے؟ یہی کہ اب ہمارے نیک اعمال کا فیصلہ خدا کرے گا، اس فیصلہ کے بعد اس نیک عمل پر ایسا بدلہ ہمیں دے گا کہ کوئی دوسرا ویسا بدلہ دے ہی نہیں سکتا۔

تو جیسے: وہ اپنی ذات میں وحدہ لاشریک ہے، اسی طرح اس کی سزا بھی وحدہ لاشریک ہے، اس کی جزاء بھی وحدہ لاشریک ہے، ہر چیز کے اندر وحدانیت ہے۔ اگر کوئی

---

(۱) وأخرج أبو القاسم اللالكائي في السنة عن سلمان قال: يوضع الميزان وله كفتان لو وضع في إحداهما السماوات والأرض ومن فيهن لوسعته. (فتح الباری ۱۳/۵۴۸)

سمجھنا چاہے تو لفظ ﴿نَضَعُ﴾ میں ساری باتیں ہیں، لفظ ﴿نَضَعُ﴾ توحید فعلی (پر دلالت کر رہا) ہے؛ (اس لیے کہ اس کا مفہوم ہے کہ) یہ رکھنا صرف میرا کام ہے اور معاملہ کو نمٹا کر سزا دینا اور ایسی سزا دینا جو کوئی نہیں دے سکتا، یہ بھی میرا ہی کام ہے اور نیک کام کرنے والوں کو ایسی جزاء دوں گا کہ کوئی دوسرا دے ہی نہیں سکتا۔ جس مجرم کو سزا دیدوں گا، وہ کبھی خوشی کا منہ نہیں دیکھ سکے گا اور جس نیکوکار کو میں خوش کر دوں گا، اس کو کبھی غم کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، غم کے لئے بھی خلود اور خوشی کے لئے بھی خلود، کیوں کہ وہ تو عالم خلود ہے، جو ہوگا وہ ہمیشہ کے لئے باقی رہے گا، اس میں ردوبدل کی کوئی گنجائش نہیں، یہاں تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک عدالت سے فیصلہ ہوگیا ہے، اب ہائی کورٹ جا کر درخواست دیدیجئے، وہاں سے ہو جائے ٹھیک نہیں تو سپریم کورٹ چلے جائیے؛ لیکن اللہ کی عدالت سے جو پاس ہو جائے، اس کے علاوہ بھی کوئی کورٹ ہے؟ (ہرگز نہیں) جو ہو گیا دودھ تو دودھ ہے، پانی تو پانی ہے وہاں اس عدالت کے میں کسی کی نہیں چلے گی، اللہ واحد، اس کی عدالت واحد، اس کی میزان عدل واحد، اس کی سزا واحد، اس کی جزاء واحد، سب کچھ واحد ہے، وحدہ لاشریک؛ ہر چیز کے اندر وحدانیت ہے۔

## کتاب کے پہلے اور آخری حدیث کے باب میں آیت کا شاندار انتخاب

امام بخاریؒ قرآن کریم کی آیات چھانٹ چھانٹ کر لاتے ہیں، یہاں ﴿نَضَعُ﴾ والی آیت لائے ہیں، جو توحید فعلی پر دلالت کر رہی ہے اور اُدھر شروع میں پڑھا ہے: ﴿إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِن بَعْدِهِ﴾ (النساء:۱۶۳) وہاں بھی توحید فعلی ہے: کیوں کہ وحی کرنا صرف میرا (اللہ) کام ہے، میرے سوا کسی میں وحی کرنے کی طاقت نہیں ہے؛ اس لئے اللہ نے حصر کے ساتھ بیان کر دیا: ہم ہی ہیں وحی کرنے والے، ہمارے سوا کسی کے اندر وحی کرنے کی طاقت نہیں، وحی کے اندر بھی توحید فعلی اور ﴿نَضَعُ﴾ کے اندر بھی توحید فعلی ہے۔

وہاں کہاہے: جو میں نے وحی بھیجی ہے، اسی کے مطابق تم سب عمل کرنا، جب میرے پاس آؤگے تورائی رائی اور پائی پائی (کا حساب) تم میرے پاس پاؤگے، ہم خود فیصلہ کریں گے، ہم خود کیس اپنے ہاتھ میں لیں گے، مجرمین کے ساتھ کیا برتاؤ ہوگا؟ محسنین کے ساتھ کیا ہوگا؟ امام بخاریؒ نے یہی توحید فعلی کا پیغام دینے کے لیے ہی عنوان کے اندر قرآن کریم کی یہ آیت پیش کی ہے۔

## کلمہ ''الْمَوَازِیْنَ'' کی تحقیق

موازین: یہ کس کی جمع ہے؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ میزان کی جمع ہے۔ میزان واحد ہے اگر اس کو جمع کا صیغہ مان لیں تو پھر جمع کا مطلب کیا ہوگا کہ بہت ساری ترازوئیں، وہاں ہوں گی، صرف ایک ترازو نہیں ہوگی، یہ جمع ہے (اگر اس قول کو مانا جائے تو) اب اس کی دو شکل ہے۔

## ہر عمل کے لئے الگ ترازو

(۱) ایک شکل یہ ہے کہ ہر عمل کے لئے الگ الگ ترازوئیں ہوں گی، مثلا: فرض ناپنے کے لئے الگ ترازو، نفل ناپنے کے لئے الگ ترازو، حقوق دلانے کے لئے الگ ترازو، حقوق العباد ناپنے کے لئے الگ ترازو، بدنی عبادت ناپنے کے لئے الگ ترازو اور مالی عبادت ناپنے کے لئے الگ ترازو، دنیا میں بھی ایسا ہی ہے کہ ہر چیز کو ناپنے کے لئے الگ الگ ترازو ہوتی ہے، کسی ترازو سے لکڑی کو تولا جاتا ہے تو کسی ترازو سے غلہ ناپا جاتا ہے، وہ اور طرح کی ترازو ہوتی ہے، کسی ترازو سے سونا چاندی کو تولا جاتا ہے، وہ کسی اور طرح کی ترازو ہوتی ہے، سب ترازو ایک طرح کی نہیں ہوتی، جیسی روح ویسا فرشتہ اور ایک ترازو ہے بخار کو ناپنے کے لئے، یہ ترازو الگ ہے، جسے ہم اور آپ تھرمامیٹر کہتے ہیں، ایک ترازو اور ہے: وہ ہے درجۂ حرارت اور درجہ برودت کو ناپنے کے لئے، سائنسدانوں نے آلے ایجاد کیے ہیں، آج درجۂ حرارت کتنا ہے اور آج درجۂ برودت

کتنا ہے؟ اس کے لئے ترازو الگ ہے، جس طرح دنیا میں ہر چیز کو ناپنے کیلئے الگ الگ ترازو ہیں، آخرت کے اندر ہر عمل کو ناپنے کے لئے الگ الگ ترازو ہیں، ہر شخص کیلئے الگ الگ ترازو ہے، زید کا عمل ناپنے کے لئے الگ ترازو، عمرو کا عمل ناپنے کے لئے الگ ترازو، بے شمار لوگ ہوں گے تو بے شمار ترازوئیں بھی ہوں گی (۱) امام رازیؒ اسی معنی کو ترجیح دیتے ہیں؛ کیوں کہ جب اس کے حقیقی معنی بن رہے ہیں اور اس میں کوئی استحالہ نہیں ہے تو پھر مجازی معنی کیوں مراد لیا جائے۔

بعض لوگوں نے اس سے مجازی معنی مراد لئے ہیں کہ ترازو تو ایک ہوگی؛ لیکن بڑی عظیم الشان ترازو ہوگی، دیکھنے میں ایک ہوگی؛ مگر تن تنہا وہ سب کام کرے گی، دیکھنے میں ایک، کام کے اعتبار سے جمع، جیسے قرآن کریم میں ہے: ﴿كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ (الشعراء:۱۰۵) نوحؑ تو تنہا تھے، نوحؑ کی قوم نے سارے رسولوں کو (کیسے) جھٹلایا؟ اس کا مطلب ہے کہ نوحؑ کو جھٹلانا سارے رسولوں کو جھٹلانا ہے، نوح علیہ السلام کی عظمت شان کی وجہ سے ''مرسلین'' جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے (۲) اسی طرح ترازو تو ایک ہوگی؛ لیکن ساری ترازو کا وہ ہی تنہا کام کرے گی؛ اندازہ کیجئے کہ ایک ترازو جو تنہا تمام ترازوؤں کا کام کرے، وہ کتنی عظیم الشان ترازو ہوگی؟ عظمت شان کو بتانے کے لئے جمع کا لفظ (موازین) لایا گیا ہے۔

(۲) بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ موازین: میزان کی جمع نہیں ہے؛ بلکہ یہ ''موزون'' کی جمع ہے۔ اور موزون سے ''اعمال موزونہ'' مراد ہیں، جن اعمال کا وزن کیا جائے گا، وہ بے شمار وزن کے ہوں گے، (اعتراض یہ ہے کہ) اب تو ترازو کی

---

(۱) واختلف في ذكره هنا بلفظ الجمع هل المراد أن لكل شخص ميزانا أو لكل عمل ميزان فيكون الجمع حقيقة. (فتح الباری ۱۳/۶۷۰)

(۲) ويحتمل أن يكون الجمع للتفخيم كما في قوله تعالى كذبت قوم نوح المرسلين مع أنه لم يرسل إليهم إلا واحد. (فتح الباری حوالہ سابق)

کوئی ضرورت ہی نہیں پڑے گی، تواب یہاں (جمع کے صیغہ سے) کس کی کثرت بتانا (مطلوب) ہے؟ (جواب یہ ہے کہ) ان اعمال کی کثرت بتائی جارہی ہے، جن کو تولا جائے گا۔

امام رازیؒ کا رجحان پہلے معنی کی طرف ہے؛ لیکن دوسرے معنی بھی بن سکتے ہیں؛ کیوں کہ اس میں کوئی استحالہ نہیں ہے؛ مگر ان کا رجحان یہی ہے کہ حقیقی معنی رہتے ہوئے مجازی معنی کی ضرورت نہیں ہے اور شاید امام رازیؒ کا رجحان بھی اسی طرف اس لئے ہے کہ اللہ تعالی کی قدرت سے کونسی چیز بعید ہے، بے شمار ترازو پیدا کردے اور خود قرآن میں اس کی طرف اشارہ ہے: ﴿فَاَمَّامَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ﴾ (القارعۃ:٦). ﴿وَاَمَّامَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ﴾ (القارعۃ:٨) آیت سے اشارہ ہورہا ہے کہ ترازوئیں مختلف ہوں گی۔(۱)

## الموازین القسط کی نحوی ترکیب

﴿وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ﴾ نحوی ترکیب کے اعتبار سے موازین موصوف اور قسط اس کی صفت ہے، موصوف اور صفت میں مطابقت ضروری ہے: تذکیر وتانیث واحد، تثنیہ اور جمع میں بھی؛ لیکن یہاں پر مطابقت نہیں معلوم ہورہی ہے کیوں کہ موازین جمع ہے اور قسط مفرد ہے اور موازین جمع مکسر ہے جو مؤنث (کے حکم میں) ہے اور قسط مذکر ہے، نہ تو واحد جمع میں مطابقت ہے اور نہ تذکیر وتانیث میں مطابقت ومناسبت ہے؟

جواب: (۱) یا تو قسط مصدر ہے اور مصدر واحد ہوکر بھی جمع ہی کا کام دیتا ہے کیوں کہ مصدر اسم جنس ہے اور قلیل وکثیر سب کے لئے استعمال ہوتا ہے؛ اس لئے یہ لفظی اعتبار سے مفرد ہی ہے؛ مگر جمع ہی کا کام دیتا ہے۔(۲) بعض نے اس کی توجیہ کی ہے کہ قسط سے پہلے ذوات محذوف ہے، تقدیری عبارت ہے: ''ذَوَاتِ الْقِسْطِ'' لفظ ''ذوات''

---

(۱) والجمع باعتبار تعدد الأعمال أو الأشخاص ويدل على تعدد الأعمال قوله تعالى ومن خفت موازينه. (فتح الباری حوالہ سابق)

مقدر ہے، تو اب یہ مؤنث بھی ہوگیا اور جمع بھی۔ (اس طرح موصوف اور صفت میں مطابقت ہوگئی)

(۳) بعض حضرات نے کہا ہے کہ موصوف، صفت ماننے کی ضرورت نہیں ہے؛ بلکہ ''اَلْقِسْطُ'' کو'' نَضَعُ'' سے مفعول لہ مان لیں اور لام کو مقدر مانیں، تو اس صورت میں یہ ''نَضَعُ'' کا مفعول لہ ہوجائے گا اور معنی ہوں گے: ''وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ: اَىْ لِأَجْلِ الْقِسْطِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ'' اور ''لام'' کو ''فِيْ'' کے معنی میں لے لیں۔

## '' الْقِيَامَةِ '' کی تشریح

یہ قیامت کا نام ہے، بڑا عجیب نام ہے، دل دہلانے والا نام ہے، چاہے ہمارا دل نہ دہلے؛ کیونکہ ہمارا دل تو پتھر ہے؛ لیکن اللہ نے جن کے دل کے اندر وہ بات رکھی ہے، جو چیزوں کا اثر قبول کرتا ہے، ان کا حال یہ ہے کہ قیامت کا نام سن کر انہوں نے جان دے دیں۔

## واقعہ: قیامت کے ذکر سے جاں بحق ہونا

شمائل ترمذی میں ایک روایت ہے: شہر کے ایک امام نماز پڑھا رہے تھے، فجر کی نماز تھی، نماز میں یہ پڑھا ﴿اِذَانُفِخَ فِى الصُّوْرِ﴾ (المومنون:۱۰۱) پس ان کے دل پر یہ اثر ہوا کہ جاں بحق ہوگئے، جو راوی اس روایت کو نقل کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ مسجد سے اٹھا کر ان کو گھر لایا گیا، اٹھانے والوں میں میں بھی تھا؛ لہذا ایسا بھی ہوا ہے کہ قیامت کا نام سن کر لوگوں کی جان نکل گئی ہے اور سرور انبیا ﷺ نے فرمایا کہ جن سورتوں کے اندر قیامت کا ذکر ہے ان سورتوں نے قبل از وقت مجھے بوڑھا بنا دیا ہے، ان کے ہولناک منظر کا تصور کرنے سے، وقت سے پہلے میں بوڑھا ہوگیا، جس نبی کے اندر پوری امت کے مصائب اور تکلیف کو برداشت کرنے کی طاقت ہے؛ کیوں کہ نبی معمولی طاقت کا انسان نہیں ہوتا، پوری امت کی طاقت ہوتا ہے، سب کو وہ برداشت کرتا ہے، وہ (نبی ﷺ) یہ کہہ رہے ہیں۔

## واقعہ: قیامت کے خواب سے جوان کا بوڑھا ہو جانا

علامہ زمخشریؒ نے لکھا ہے کہ ایک شخص بھر پور جوان تھا، داڑھی کے بال بھی کالے، سر کے بال سب کالے، ایک بھی سفید بال نہیں تھا، شام کے وقت میں بھر پور جوان تھا، رات میں سو کر خواب میں دیکھا کہ قیامت کا منظر ہولناک ہے، ایسے ایسے خوفناک منظر دیکھے: لوگوں کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر گھسیٹ گھسیٹ کر منہ کے بل جہنم میں ڈالا جا رہا ہے، وہ شخص اس ہولناک منظر کی تاب نہ لا سکا، جب سو کر اٹھا تو جوانی کھو چکا تھا اور بوڑھاپا آ گیا۔ اب اندازہ کیجئے کہ جو شخص خواب میں قیامت کا منظر دیکھے تو اس کا یہ حال ہو جائے، تو جب ہماری آنکھ جاگتے میں قیامت کا منظر دیکھے گی تو کیا حال ہوگا؟ یہ قیامت تو وہ ہے، جس کا نام سنتے ہی انسان کا کلیجہ دہل جاتا ہے۔

## امت کے اتحاد کا راز اور انتشار کا سبب

اہل السنۃ والجماعۃ کہہ رہے ہیں قیامت کے دن اعمال کو تولا جائے گا ہماری باتوں کو تولا جائیگا، اللہ والے کبھی قرآن اور حدیث کو عقل کے حوالہ نہیں کرتے، وہ مسلمان نہیں ہے جو قرآن اور حدیث کو عقل کے حوالہ کرے، اہل السنۃ والجماعۃ عقل کو قرآن و حدیث کے حوالے کر دیتے ہیں، اہل سنت کے نزدیک معیار کتاب وسنت ہے، جب تک مسلمانوں کا یہ ذہن تھا، مسلمانوں میں اجتماعیت تھی، مسلمان ایک تھے ان میں گروہ بندی نہیں تھی، سب مل کر ایک تھے، اصول میں سب ایک تھے، چاہے فروع میں سب الگ الگ ہوں؛ لیکن فروع کے الگ ہونے کا کوئی اثر نہیں پڑتا کیوں کہ اصول اور عقیدہ کے اندر سب ایک تھے اور جب قرآن اور حدیث کو عقل کے حوالے کرنے لگے، اسلام کے اندر تحزب اور پارٹی بندی آئی تو ایک نہیں بہتر فرقے اسلام میں آ گئے، کہیں معتزلہ پیدا ہوئے، کہیں خوارج، کہیں مرجیہ پیدا ہوئے، تو کہیں جہمیہ اور کہیں کرّامیہ پیدا ہوئے، یہ کہاں سے پیدا ہوئے؟

جس نے دین میں عقل کو شامل کیا، وہ دین سے ہٹ گیا، اہل حق کے راستے سے وہ ہٹ گیا، صحابہؓ کے راستے سے ہٹ گیا، انبیاء کے راستے سے ہٹ گیا۔ اللہ ان بدعتوں

سے ہمیں محفوظ رکھے۔ (آمین) ان بدعتوں نے امت کے اتحاد کا شیرازہ بکھیر دیا اور امت کو پارہ پارہ کر دیا، مسلمانوں کو بہتر تہتر فرقوں میں بانٹ دیا، یہ سب عقل پرستی کا نتیجہ ہے۔

آج معتزلہ کہیں نہیں رہے؛ لیکن دوسرے روپ میں آج بھی عقل پسند لوگ ہیں اور کچھ نہ دیکھو تو جنہوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی ہے، وہ چاہے زبان سے کچھ نہ کہیں؛ لیکن جو بات ان کے دل (عقل) میں آتی ہے، اس کی بارے میں ان کا دین متذبذب ہو جاتا ہے۔

## وزنِ اعمال کے سلسلے میں تیسری رائے: انسان کو تولا جائے گا

(۳) بعض لوگ کہتے ہیں: عمل نہیں تولا جائے گا؛ بلکہ عمل والا تولا جائے گا: یعنی انسان کو میزان کے اندر تولا جائے گا۔ اس کی دلیل بھی پیش کرتے ہیں: نبی ﷺ نے فرمایا: قیامت کے روز خدا کے سامنے ایک موٹا، ہٹا کھٹہ انسان کو لایا جائے گا، وہ بڑا موٹا تازہ، لحیم و شحیم ہوگا؛ لیکن اللہ کی نگاہ میں اس کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ (بخاری مسلم) اس روایت سے استدلال کرتے ہوئے، کہتے ہیں کہ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ دیکھنے میں تو وہ انسان موٹا ہوگا؛ لیکن اس کا کوئی وزن نہیں ہوگا، بالکل ہلکا ہوگا۔

مگر یہ بات دل کو زیادہ نہیں لگتی؛ کیونکہ وزن نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی نگاہ میں اس کا کوئی وزن نہیں ہوگا، جیسے بولتے ہیں کہ فلاں اتنا بڑا ہے؛ لیکن اس کی کوئی قیمت نہیں ہے، اللہ کے نزدیک وہ بے قیمت و بیکار ہے؛ لیکن اس رائے کو بالکل غلط بھی نہیں کہہ سکتے؛ کیوں کہ اس کی بعض روایات سے تائید بھی ہوتی ہے: ایک روایت ہے: عبداللہ بن مسعودؓ کی ٹانگیں بڑی پتلی تھیں، منافقین ان کی ٹانگوں کے بارے میں بڑے تبصرے کرتے تھے اور مذاق اڑاتے تھے، نبی ﷺ نے فرمایا: (۱) خدا کی قسم عبداللہ کی ٹانگیں

---

أتعجبون من دقة ساقي عبد الله لهما أثقل في الميزان من جبل أحد رواه أحمد وغيره بسند جيد (بحوالہ فتح الباری ۱۳/۱۷۶، مکتبہ دار السلام، ریاض)

دنیا میں پتلی ہیں؛ لیکن قیامت کے روز میزان کے اندر احد پہاڑ سے زیادہ وزنی ہوں گی۔
حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے لامع الدراری میں یہ روایت نقل کی ہے بعض روایت میں آتا ہے: جن کے چھوٹے بچے مرجائیں گے قیامت کے روزان چھوٹے بچوں کوتولا جائے گا۔

## نامۂ اعمال کوتولا جائے گا

(۴) ایک نظریہ ہے کہ عامل کونہیں تولا جائے گا؛ بلکہ ان کے نامۂ اعمال کوتولا جائے گا، فرشتے جس کاغذ میں ہمارا عمل لکھتے ہیں، قیامت کے روز اسی نامۂ اعمال کو تولا جائے گا، اب عامل کونہیں تولا جارہا ہے؛ بلکہ نامۂ اعمال کوتولا جائے گا۔

## پہلی دلیل: حدیثِ بطاقہ

اس کی دلیل حدیث بطاقہ ہے (۱) جومشہورحدیث ہے، قیامت کے روز ایک شخص کوبھرے مجمع میں لایا جائے گا، جس کے ننانوے (۹۹) نامۂ اعمال ہوں گے اور وہ اتنے لمبے ہوں گے کہ جہاں تک نگاہ پہونچتی ہے، وہاں تک اس کے نامہ اعمال ہوں گے اورسب نامۂ اعمال برائیوں سے بھرے ہوئے ہوں گے، ان سب کومیزان کے ایک پلہ میں رکھا جائے گا۔ اب یہ شخص سوچ رہا ہوگا کہ اب میرے لئے نجات کی کوئی شکل نہیں ہے، میرا برائی کا پلہ تو جھکتا ہی چلا جارہا ہے، ناکامی میرے سامنے ہے جہنم میرے سامنے ہے، اللہ کہے گا کہ بندہ یہ تو بتا کہ ہمارے فرشتے کراماً کاتبین نے تم پرکوئی ظلم تونہیں کیا؟ کہ جوکام تم نے نہیں کیا، وہ بھی انہوں نے اپنی طرف سے لکھدیا ہو؟ بندہ کہے گا: یااللہ! بالکل ظلم نہیں کیا، بالکل صحیح لکھا ہے؛ فرشتے خداتعالی کی نافرمانی نہیں کرتے۔

اللہ کہے گا کہ اے بندہ تو آج اپنے نامہ اعمال کودیکھ کر بالکل مایوس ہورہا ہے، آج کسی پرظلم نہیں ہوگا، ذرہ ذرہ کا بدلا دیا جائے گا، اللہ تعالی کہے گا کہ ایک چھوٹا سا کاغذ

---

(۱) ورجح القرطبي أن الذي يوزن الصحائف التي تكتب فيها الأعمال ونقل عن ابن عمر قال توزن صحائف الأعمال قال فإذا ثبت هذا فالصحف أجسام فيرفع الإشكال ويقويه حديث البطاقة الذي أخرجه الترمذي. (فتح الباری ۱۳/ ۶۷۲، دارالسلام، ریاض- عمدۃ القاری ۶/ ۳۷۱، زکریا بکڈپو، دیوبند)

تمہارا ہمارے پاس ہے، تب وہ کہے گا کہ کہاں برائی کے ننانوے دفتر اور کہاں ایک چھوٹا سا پرچہ، اس کی کیا حیثیت ہے؟ کہا جائے گا کہ آج کسی پر ظلم نہیں ہوگا؛ چنانچہ ایک پلے پر ننانوے دفتر رکھے جائیں گے اور ایک پلے پر یہ چھوٹا سا کاغذ کا ٹکڑا رکھا جائے گا، تو یہ کاغذ والا پلہ بھاری ہوجائے گا اور وہ (ننانوے دفتر کا پلہ) ہلکا ہوجائے گا، اس پرچہ میں کیا تھا؟ اللہ کہے گا کہ بندہ تو نے اخلاص کے ساتھ کہا تھا ''اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ'' یہ دیکھو تمہارا یہ عمل اور یہ کاغذ ہمارے پاس محفوظ ہے، یہ تمہارے کام آئے گا۔(۱)

نبی ﷺ اس حدیث کو بیان فرما کر کہتے ہیں: خدا کی قسم اللہ کا نام آسمان وزمین اور اس کے درمیان جتنی چیزیں ہیں اور زمین کے نیچے جتنی چیزیں ہیں، اللہ کا نام ان سب سے بھاری ہے، اس کے وزن کا مقابلہ کوئی بھی نہیں کرسکتا، اس حدیث سے صاف معلوم ہورہا ہے کہ نامہ اعمال کو تولا جائے گا، حدیث بطاقہ اس کی دلیل ہے۔

## دوسری دلیل

اسی سے متعلق ایک اور حدیث آتی ہے کہ ایک شخص کا نامۂ اعمال تولا جائے گا، برائی کا پلہ بھاری ہوجائے گا اور نیکی کا پلہ ہلکا ہوجائے گا، اتنے میں ایک شخص ناخن کے سرے کے برابر کاغذ کا ٹکڑا لے کر آئے گا اور اس کے نیک اعمال کے پلے میں وہ ٹکڑا ڈالدیا

(۱) ويؤيد هذا حديث البطاقة المروي في الترمذي وقال حسن غريب وابن ماجه وابن حبان في صحيحه والحاكم والبيهقي من حديث عبد الله بن عمرو بن العاص رضي الله عنهما أن رسول الله ﷺ قال إن الله يستخلص رجلا من أمتي على رؤوس الخلائق يوم القيامة فينشر يوم القيامة تسعة وتسعين سجلا كل سجل مثل مد البصر ثم يقول أ تنكر من هذا شيئا؟ أ ظلمك كتبتي الحافظون؟ فيقول لا يا رب فيقول أ فلك عذر؟ فقال لا يا رب فيقول الله تعالى بل إن لك عندنا حسنة فإنه لا ظلم عليك فتخرج بطاقة فيها أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمدا عبده ورسوله فيقول أحضروا وزنك فيقول يا رب ما هذه البطاقة مع هذه السجلات فيقول فإنك لا تظلم فتوضع السجلات في كِفة والبطاقة في كِفة. (قسطلانی ۱۵/۶۲۸)

جائے گا تو اس کی برکت سے نیکی کا پلہ بھاری ہو جائے گا، اب یہ شخص حیران ہوگا کہ ایسے وقت میں کون کام آیا! اللہ اس کے چہرے کو تر و تازہ رکھے، (وہ پوچھے گا کہ) آپ کون شخص ہیں؟ کہ ناامیدی میں امید دلا دی، پوچھنے پر کہا جائے گا کہ میں تمہارا رسول ﷺ ہوں، تم نے ایک بار مجھ پر درود بھیجا تھا، وہ درود کا ٹکڑا میرے پاس تھا، آج وہ تمہارے کام آیا کہ اس نے نیکی کے پلے کو برائی پر بھاری کر دیا۔ ایک ایک درود کا یہ حال ہوگا؛ اس لئے کہا جاتا ہے کہ انسان کو کوئی عمل، جو چھوٹے سے چھوٹا ہو، اس کو کبھی چھوٹا نہیں سمجھنا چاہئے ؛ پتہ نہیں کونسا عمل کام آجائے گا۔

## تیسری دلیل

ملا علی قاریؒ نے لکھا ہے کہ ایک شخص کا نامۂ اعمال تولا جا رہا ہوگا اور اس کی نیکی کا پلڑا ہلکا ہو جائے گا، دیکھ رہا ہوگا کہ میری نیکی کا پلہ ہلکا ہوگیا ہے، اتنے میں اوپر سے ایک پوٹلی گرے گی، گرنے کے بعد اس کے (نیکی کے) پلے کو بھاری کر دیگی یہ شخص پوچھے گا کہ یہ کیا چیز ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ پوٹلی میں کوئی بڑی (بھاری) چیز ہے؟ تو کہا جائے گا کہ یہ مٹی ہے، جو تو نے کسی مسلمان بھائی کی قبر پر اخلاص کے ساتھ ڈالی تھی، آج وہ مٹھی بھر مٹی کام آجائے گی، کبھی گناہ کو چھوٹا مت سمجھو اور کبھی نیکی کو بھی چھوٹی مت سمجھو، نہیں معلوم، خدا کس کے طفیل میں ہماری بخشش کر دے، کبھی بڑا عمل دھرا رہتا ہے اور چھوٹے سے چھوٹا عمل کام آجاتا ہے، یہ سب اس لئے بتلایا جا رہا ہے کہ بعض حضرات کا خیال ہے کہ نامۂ اعمال تولا جائے گا۔

## وزنِ اعمال کے سلسلے میں چوتھی رائے

چوتھا نظریہ جو سب سے بہترین نظریہ ہے کہ نہ نامۂ اعمال کو لیجئے، نہ عامل کو لیجئے ؛ بلکہ یہ روزہ اور نماز ہیں، یہی قیامت کے دن تولے جائیں گے۔ معتزلہ نے اسی میں اختلاف کیا ہے۔

## معتزلہ کا مذہب

معتزلہ کہتے ہیں کہ نماز روزہ، یہ سب کے سب تو اَعراض ہیں، یہ باقی رہنے والی چیز نہیں ہے، یہ نکلے اور نکلنے کے بعد ختم ہو گئے، جب یہ گرفت میں نہیں آ رہی ہے تو پھر اس کو کیسے تولا جائے گا؟ معتزلہ نے اس طرح کی آیتوں کو اپنی عقل کی کسوٹی پر جانچا پھر تاویل کی یا اس کا انکار کر دیا۔(۱)

## معتزلہ کا رد قرآن وحدیث اور سائنس کی روشنی میں

حالانکہ آج اگر معتزلہ موجود ہوتے تو ان کو اپنے اس نظریہ پر بڑی ندامت ہوتی، بڑا اپچھتاوا ہوتا، آج ہمارے سائنس داں کہہ رہے ہیں: جتنی باتیں بولی جا رہی ہیں، وہ سب فضاؤں کے اندر محفوظ ہیں، اب تو یہ سائنسداں مشین ایجاد کر رہے ہیں کہ بڑے بڑے لوگوں کی آواز کو ٹیپ کر کے دنیا کے اندر اس کو مشہور کیا جا رہا ہے، حضرت آدمؑ کی بات کو، نوح علیہ السلام کی بات کو، حضرت ابراہیمؑ کی بات کو اور نبی کریم ﷺ کی باتوں کو، فلاسفہ کی باتوں کو۔

## اعراض کا باقی رہنا قرآن وحدیث کی روشنی میں

یہ مت سمجھئے کہ ان کے کہنے کی وجہ سے ہم کہتے ہیں اور ہم ان کی باتوں کو مان رہے ہیں، ہم نے تو مانا ہے پہلے قرآن کو، قرآن کو مان کر پھر ان کو بتایا ہے، قرآن تو پہلے کہہ چکا ہے: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ (ق:۱۸) جو بھی بات تمہاری زبان سے نکلتی ہے، سب محفوظ ہے۔ ہم نے قرآن کو مان کر سائنسدانوں کو مانا ہے؛ ورنہ صرف سائنسدانوں کی کیا حقیقت ہے؟ یہ تو قرآن کی بات ہے اور اس میں استحالہ کی بات کیا ہے؛ کیوں کہ یہ بات ختم ہونے والی نہیں ہے؛ بلکہ جو بات منہ سے نکلتی ہے، وہ فضاء میں گھومتی رہتی ہے۔

---

وقال ابن فورك أنكرت المعتزلة الميزان بناء منهم على أن الأعراض يستحيل وزنها إذ لا تقوم بأنفسها. (فتح الباری ۱۳/۶۷۱، مکتبہ دار السلام، ریاض)

حدیث میں آتا ہے: کوئی آدمی کسی کو کافر کہہ دے تو یہ کافر کا لفظ نکلنے کے بعد اس سے ضائع نہیں ہوتا، وہ دیکھتا ہے کہ اس کافر کا مستحق کون ہے، یہ جس کو کافر کہا گیا ہے، اگر وہ واقعی کافر ہے، تو یہ کلمہ اس کے کے ساتھ لگ جاتا ہے اور اگر وہ مستحق نہیں ہے تو جس نے کہا ہے اسی کے ساتھ لگ جاتا ہے، اگر یہ بات (منہ سے) نکل کر ختم ہو جاتی، تو لگنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔

حدیث میں ہے کہ جو تم بولتے ہو اگر تم نے کسی کے بارے میں نامناسب لفظ استعمال کیا، تو وہ اس کو نہ لگے گا، تم کو ضرور لگ جائے گا اور قرآن وحدیث کے اندر بہت سی ایسی مثالیں ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اعمال باقی رہنے والی چیز ہے، اعمال ختم ہونے والی چیز نہیں ہے۔

## حضرت شاہ ولی اللہؒ کا واقعہ

اللہ کبھی چاہتے ہیں اور نہ دیکھی جانے والی چیز کو کبھی اپنے خاص بندوں کو دکھا دیتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ فیوض الحرمین میں لکھتے ہیں کہ میں نے روضۂ انور کے پاس بیٹھ کر مراقبہ کیا، تو مجھے ایسا دیکھنے میں آیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ انور سے ایک نور کی لکیر نکل رہی ہے اور یہ نور کی لکیر نکل کر دنیا میں جتنے محدث، حدیث میں مشغول ہیں، سب کے سینے کے ساتھ وہ نور لگا ہوا ہے۔ دیکھئے روضۂ انور کا نور آپ کو ہم کو دکھائی نہیں دیتا، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے دیکھا ہے، اللہ تعالی کسی کی آنکھ میں ایسی طاقت دے دیتا ہے۔ خوب سن لیجئے، اگر یہ آنکھ آپ کو نہیں ملی ہے، تو اللہ قیامت کے دن دے ہی دیگا اور سب کچھ دیکھ لیں گے جو حدیث کے اندر آتا ہے۔

## امام ابوحنیفہؒ کا واقعہ

آپ واقعات میں بھی دیکھیں کہ امام ابوحنیفہؒ کوفہ کی جامع مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک جوان وضو کر کے فارغ ہوا، امام صاحب نے اس کو بلایا اور کہا کہ بیٹا ماں باپ کی

نافرمانی سے توبہ کرو، تم نے جو وضو کیا ہے، میں نے تمہارے وضو کے پانی میں ماں باپ کے ساتھ نافرمانی کا گناہ گرتے ہوئے دیکھا ہے۔

ایک دوسرا شخص آیا، اس نے وضو کیا، امام صاحب نے اس کو بلایا اور فرمایا: ''تُبْ عَنِ الشُّرْبِ'' یعنی شراب نوشی سے توبہ کر، تو نے جس وقت وضو کیا، تو میں نے شراب پینے کا گناہ تمہارے وضو کے قطروں میں گرتے ہوئے دیکھا ہے؛ اس لئے توبہ کرو۔ اسی طرح تیسرے شخص سے کہا کہ تو زنا سے توبہ کر کہ میں نے تمہارے وضو کے قطرہ سے وہ گناہ گرتے ہوئے دیکھا ہے۔

اللہ کے بندے ان اعمال کو دنیا کے اندر دیکھ رہے ہیں، جو کہ غیر نبی ہیں: امام ابوحنیفہ نبی نہیں تھے، نبی ﷺ نے تو فرمایا: میں نے قیامت کے قریب اس امت میں فتنے رونما ہونے والے ہیں، وہ (فتنے) میں نے ایک ایک گھر میں اترتے ہوئے ان نظروں سے دیکھے ہیں؛ امام اعظم ابوحنیفہ زنا (کا گناہ) دیکھ سکتے ہیں تو حضور ﷺ فتنہ نہیں دیکھ سکتے؟ ارے معتزلہ تمہارے پاس آنکھ نہیں تو کیا مطلب کسی کے پاس آنکھ نہیں ہے تم نہیں دیکھتے تو اس کا کیا نتیجہ ہے، اللہ تعالی جس کو چاہے گا دنیا میں دکھا دے گا اور سب کو تو قیامت کے دن دیکھنا ہی ہے۔

## حضرت علامہ کشمیریؒ کی توجیہ

ہمارے حضرت علامہ کشمیریؒ نے بڑی اچھی بات کہی ہے: حدیث: ''فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ اِلَى اللّٰهِ'' اس میں '' هِجْرَتُهُ اِلَى اللّٰه'' شرط بھی ہے اور یہی ٹکڑا جزاء بھی ہے؛ حالانکہ نحو کے قاعدہ کے اعتبار سے شرط اور جزاء میں مغایرت ہونی چاہئے، علماء اس جملہ (فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ اِلَى اللّٰهِ) کی بہت توجیہ میں پڑے ہوئے ہیں، شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: کسی توجیہ کی ضرورت نہیں ہے، اس جملہ کا مطلب ہے: جو آپ نے ہجرت کی ہے، یہی ہجرت آپ کو قیامت کے دن مل جائے گی، اس ہجرت کو تم یہاں نہیں دیکھ سکتے ہو؛ لیکن یہی ہجرت قیامت کے دن تمہاری نگاہ میں متمثل ہو کر (جسم بن کر) تمہارے

سامنے آجائے گی۔

تم جو نماز پڑھتے ہو نماز کا بدلہ نہیں ملے گا؛ بلکہ یہی نماز تم کو مل جائے گی۔ یہی زکوٰۃ تم کو ملے گی، یہی روزہ تم کو ملے گا اور یہی حج تم کو ملے گا، قیامت کے روز سب کچھ تمہاری نگاہوں کے سامنے ہوگا اور (اے معتزلہ) کیوں انکار کرتے ہو؟ جب کہ قرآن میں ہے: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ اور قرآن کریم کی دوسری آیت کے اندر ہے: ﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا﴾ (الکہف:۴۹) قیامت کے روز لوگ اپنے تمام اعمال موجود پائیں گے، یہ قرآن ہے، حدیث نہیں ہے، معتزلی تو انکار کیوں کرتا ہے؟ قرآن میں تو (غلط) تاویل کیوں کرتا ہے؟ قرآن میں ہے: ﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا﴾ تم نے نماز پڑھی ہے، نماز کو وہاں دیکھو گے، یہ نماز کھڑی ہے، زکاۃ کھڑی ہے، یہ روزہ کھڑا ہے، حج کھڑا ہے، یہ ہماری ہجرت کھڑی ہے۔(۱) حضرت شاہ صاحبؒ نے بڑی نادر تحقیق کی ہے۔

بہرحال چوتھی توجیہ جو اہل سنت والجماعۃ نے کی ہے، وہ یہی ہے کہ جو اللہ ہم کو مٹی سے بنا سکتا ہے، کیا وہ نماز کو شکل وصورت نہیں دے سکتا ہے؟ کیا وہ زکاۃ کو شکل وصورت نہیں دے سکتا؟ اگر وہ بھی کسی چیز سے عاجز ہے تو پھر ہم میں اور خدا میں کیا فرق ہے؟ ہمارے اور خدا میں تو یہی فرق ہے، جو کوئی نہ کر سکے وہ خدا کر دے گا یہی توحید فعلی ہے۔

## آج کل ہر چیز پیمائش کی جا سکتی ہے

امام بخاریؒ فرماتے ہیں: ”وَاَنَّ اَعْمَالَ بَنِیْ اٰدَمَ وَقَوْلَهُمْ تُوْزَنُ“ اصل یہی چیز ہے کہ انسان کا عمل اور قول نامۂ اعمال کے اندر تولے جائیں گے، آج ہمیں نظر نہیں آرہا

(۱) والحق عند أهل السنة أن الأعمال حينئذ تجسد أو تجعل في أجسام فتصير أعمال الطائعين في صورة حسنة وأعمال المسيئين في صورة قبيحة ثم توزن. (فتح الباری ۱۳/۶۶۲، دار السلام، ریاض) وقد روى بعض المتكلمين عن ابن عباس رضي الله عنهما إن الله تعالى يقلب الأعراض أجساما فيزنها أو توزن صحفها. (قسطلانی)

ہے، یہ سردی، گرمی اور حرارت، اس کا پوائنٹ ہم دیکھتے ہیں؛ لیکن ترازو سائنسدانوں نے نکالا ہے، دیکھ کر کہا جاتا ہے: آج درجۂ حرارت اتنا ہے، بخار کو تم دیکھ نہیں سکتے، تھرمامیٹر لگاتے ہو تو معلوم ہو جاتا ہے کہ بخار اتنے پوائنٹ ہیں، ارے بندوں کے اندر یہ طاقت ہے کہ بخار ناپنے کے لئے ترازو پیدا کردیں، درجۂ حرارت کو ناپنے کے لئے مشین پیدا کردیں، تو کیا اللہ کو اتنی طاقت نہیں ہے کہ نماز کو ناپنے کے لئے ترازو بنادے، روزہ کو ناپنے کے لئے ترازو بنادے، (اگر ایسا نہیں) تب تو اللہ تعالی اس سے بھی زیادہ عاجز ہوگا اور پھر وہ بندہ، بندہ کیسے ہوگا اور خدا، خدا کیسے ہوگا خدا تو وہی ہے، جو کام کوئی نہ کرسکے، وہ کرکے دیکھادے۔

## حدیث کا پیغام

''وَاَنَّ اَعْمَالَ بَنِیْ اٰدَمَ وَقَوْلَهُمْ تُوْزَنُ'' ساری باتیں تولی جائیں گی یہی توحید فعلی ہے، لوگوں زبان کو سنبھال کر چلاؤ، جو بات بولوگے، وہ خدا کے یہاں محفوظ ہے، کس کی تم غیبت کر رہے ہو، کوئی نہیں دیکھتا ہے، وہ غیبت قیامت کے روز تمہارے سامنے کھڑی ہونے والی ہے، اگر بات ختم ہونے والی ہوتی تو ریڈیو کی ایجاد نہ ہوتی، ٹیلی فون کی ایجاد نہ ہوتی، وائرلیس کی ایجاد نہ ہوتی اور موبائیل کی ایجاد نہ ہوتی، آج تو سائنسدانوں نے یہ بتادیا کہ جو آواز نکلتی ہے، وہ محفوظ ہے، امریکہ میں بولی گئی آواز آپ یہاں سن رہے ہیں۔

## جو اللہ کے سامنے نہیں جھکتا وہ غیر اللہ کے سامنے جھکتا ہے

آج ہم سائنس کو مانتے ہیں اور نہیں مانتے ہیں تو خدا کو، یہی تو وجہ ہے کہ جو خدا کے سامنے نہیں جھکتا، اس کو منکر خدا کے سامنے جھکنا پڑتا ہے، یہ اس کی سزا ہے، تم نے خدا کی بات: ﴿مَا يَلْفِظُ﴾ کو نہیں مانا اور سائنسدانوں کی باتوں کو مانا، ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیے، خدا کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے، ہم تو کہتے ہیں کہ اس کی ایجاد ہونے سے پہلے ہم اس کو مانتے ہیں، اس پر ہمارا ایمان تو پہلے سے ہی تھا کہ سارے عمل کا اور ساری باتوں کا

قیامت کے روز وزن کیا جائے گا، یہی امام بخاریؒ کا اصل مقصد ہے کہ اللہ وزن کرنا چاہے تو قول کا بھی وزن کریں گے اور عمل کا بھی وزن کریں گے، تم نہ کرسکو، اللہ تعالیٰ ضرور کریں گے، ہر چیز کا ہم انکار کرسکتے ہیں؛ مگر اللہ کی قدرت کا ہم انکار نہیں کرسکتے ﴿اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ﴾.

## قسط اور قسطاس کی تحقیق

**وَقَالَ مُجَاهِدٌ: اَلْقِسْطَاسُ بِالرُّوْمِيَّةِ،وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ.**

قرآن میں ایک جگہ ''قِسْطٌ'' کا لفظ لایا گیا، اسی کی مناسبت سے ''قِسْطَاسٌ'' کے لفظ کو ذکر کررہے ہیں، ''قِسْطَاسٌ'' کے بارے میں امام بخاری مجاہدؒ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ لفظ ''قِسْطَاسٌ'' یہ رومی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی انصاف کے ہیں اور یہ لفظ قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے، یہ مت سمجھئے کہ یہ عربی کا لفظ نہیں ہے، یہ عربی کا بھی لفظ ہے اور رومی زبان کا بھی لفظ ہے ؛لیکن دونوں کے اندر معنی کے اعتبار سے فرق ہے: رومی زبان میں ''قِسْطٌ'' اور ''قِسْطَاسٌ'' کے معنی انصاف اور عدل کے ہیں اور عربی میں ''قِسْطٌ''، ترازو کا معنی دے رہا ہے، دونوں معنی دے رہا ہے، عدل کے معنی بھی ترازو کے ہیں ،مجاہد کہتے ہیں کہ ''قِسْطَاسٌ'' رومی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی عدل کے ہیں۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ متضاد ہے، اس کے معنی عدل کے بھی ہیں اور ظلم کے بھی ہیں، دونوں معانی آسکتے ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ ایسا بھی ہے ''قِسْطٌ'' قاف کے کسرے کے ساتھ ہو تو اس کے معنی انصاف کے ہیں اور قاف کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کے معنی ظلم کے ہیں۔

بعض حضرات یہ بھی کہتے ہیں کہ ثلاثی مجرد (قَسَطَ، یَقْسِطُ) سے ''قِسْطَاسٌ'' کے معنی ظلم کے ہیں اور اَقْسَطَ: باب افعال سے ہو تو اس کے معنی عدل کے ہوں گے؛ کیونکہ باب افعال کی ایک خاصیت ہے سلب ماخذ، چونکہ اس کے (ثلاثی مجرد میں) معنی ظلم کے ہیں، (اب باب افعال میں اس ماخذ) ظلم کو نکالیں گے، تو عدل کے معنی ہوں گے؛ لیکن امام

بخاری کے کہنے کے مطابق زیادہ بہتر بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ ثلاثی مجرد میں بھی ''قِسْطٌ''، متضاد معنی دیتا ہے اور ثلاثی مزید کے اندر بھی مختلف معنی دیتا ہے، عدل کے معنی بھی دیتا ہے اور ظلم کے معنی بھی دیتا ہے۔(۱)

تو اب یہاں کونسا معنی مراد لیں گے، سیاق وسباق دیکھ کر معنی متعین کیا جائے گا؛ چنانچہ قرآن کے اندر دو جگہ یہ لفظ استعمال ہوا ہے ایک مقام پر ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ لفظ ''يُحِبُّ'' قرینہ ہے کہ یہاں ظلم کے معنی نہیں؛ بلکہ عدل کے معنی ہیں اور قرآن میں دوسری جگہ ہے: ﴿وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا﴾ لفظ ''قسط'' ظلم کے معنی میں بھی ہے اور عدل کے معنی میں بھی ہے؛ لیکن ''بِجَهَنَّمَ'' کے قرینہ کی وجہ سے کہا جائے گا کہ یہاں ظلم کے معنی ہیں؛ کیونکہ ظالم ہی جہنم میں جائے گا؛ عادل نہیں۔

امام بخاریؒ کا رجحان بھی یہی ہے کہ چاہے ثلاثی مجرد ہو یا ثلاثی مزید ہو سیاق وسباق سے اس کے معنی متعین کئے جائیں گے؛ چنانچہ امام بخاریؒ کہہ رہے ہیں کہ ''اَمَّا الْقَاسِطُ، فَهُو الْجَائِرُ'' : لفظ ''قاسط'' جائر کے معنی میں ہے؛ اس لئے کہ قرآن میں ہے: ﴿وَاَمَّا الْقَاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا﴾ (الجن:۱۵)

## سعید بن جبیرؒ اور حجاج بن یوسف کا واقعہ

یہاں ایک بڑا نقطہ لوگوں نے لکھا ہے: سعید بن جبیرؒ جن کو حجاج بن یوسف نے قتل کیا تھا، جو اس امت کا سب سے بڑا سفاک گزرا ہے، اس کی نظر سعید بن جبیرؒ پر پڑی، وہ ان سے بیزار تھا؛ اس لئے کہ وہ اللہ والے کے علاوہ کسی کے سامنے جھک نہیں سکتے تھے: اس نے سوچا کہ ان کو ختم ہی کردیں، اس لئے ان کو بھرے مجمع میں بلایا اور مقصد تھا ان کو قتل کرنا اور ساتھ ہی یہ ظاہر کرنا کہ لوگ دیکھیں کہ یہ میرے بارے میں کیا خیال رکھتے ہیں؛ چنانچہ وہ سعید بن جبیرؒ سے سب کے سامنے پوچھتا ہے کہ حجاج کے بارے میں آپ کی کیا

(۱) فتح الباری ۱۳/۲/۶۷، دارالسلام، ریاض

رائے ہے؟ حضرت سعید بن جبیر کہتے ہیں: اَنْــتَ قَــاسِطٌ عــادِلٌ. لوگ خوش ہوگئے کہ سعید بن جبیرؒ نے بڑی تعریف کردی اور حجاج بھی خوش ہوگیا کہ سعید بن جبیرؒ حجاج کی تلوار سے تو بچ گئے؛ لیکن حجاج کچھ بھی تھا؛ مگر اس کی قرآن پر بڑی نظر تھی، اعراب اسی نے لگوائے ہیں، اس کی خدمت بھی بڑی ہے؛ اسی لئے لوگ کہتے ہیں کہ حجاج کتنا ہی غلط تھا؛ لیکن اللہ تعالی نے اس کو غیبت کے لئے وقف نہیں کردیا کہ جو چاہے اس کی غیبت کرے، جس طرح اللہ تعالی اس ظالم سے ظلم کا بدلہ لیگا، اسی طرح حجاج کی غیبت کرنے والوں سے بھی بدلہ لیگا۔

حجاج نے کہا: لوگو! افسوس ہے کہ تم سمجھے نہیں کہ یہ مجمع میں کیا کہہ رہے ہیں یہ مجمع میں کہہ رہے ہیں کہ تو ظالم اور مشرک ہے، تم لوگ ان کے فریب میں آگئے ہو دیکھو قرآن میں ہے: ﴿اَمَّــا الْـقَـاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا﴾ (الجن:١٥) حطب اور قاسط کا معنی بھی مراد لیا کہ تو ظالم اور جابر ہے اور عادل بھی کہا ہے اور اس کے معنی شرک کے آتے ہیں، قرآن میں ہے: ﴿بِــرَبِّهِــمْ يَعْدِلُوْنَ﴾ (الانعام:١٥٠) یہ لوگ بتوں کو اللہ کے برابر کرتے ہیں؛ اس لئے عادل کہہ کر مجھ کو مشرک بنایا ہے اور مجھے ظالم بنایا ہے ۔ یہ دیکھو حجاج بن یوسف ''قــاسط'' کے معنی ظالم کے لے رہا ہے، قرآن کی یہی آیت ﴿اَمَّــا الْـقَـاسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا﴾ (الجن:١٥) اس کی نظر میں ہے۔

تو امام بخاری کا مقصد (توحید فعلی) تھا، اور یہ انہوں نے اپنے ترجمۃ الباب کے اندر ذکر کردیا ہے اور یہ مقصد انہوں نے اس آیت: ﴿وَنَـضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ﴾ سے نکالا ہے؛ لہذا تاویلات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، قول ناپا جائے گا، عمل ناپا جائے گا، اس میں تاویل کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ان سب باتوں کے بعد وزن اعمال کی حدیث سے اثبات کرتے ہیں۔

## کلمتان حبیبتان کی نحوی ترکیب

كَـلِـمَـتَـانِ حَبِيْبَتَـانِ اِلَـى الرَّحْمٰنِ: كَلِمَتَان، موصوف، حَبِيْبَتَانِ، اس کی

صفت (اول) خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ یہ کَلِمَتَانِ کی صفت (ثانی) ہے ثَقِيْلَتَانِ یہ تیسری صفت ہے اور یہ سب موصوف صفت مل کر خبر مقدم ہے اور ''سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهِ'' مبتدا مؤخر ہے۔

## کَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ کی لغوی تحقیق

کَلِمَتَانِ: (کلمة کا تثنیہ ہے اور) یہاں کلمہ سے مراد کلام ہے، کلمہ مفرد مراد نہیں ہے، قرآن میں ہے: ﴿اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ﴾ (فاطر:۱۰) یہاں کلمہ سے کلام مراد ہے، مفرد (کلمہ مراد) نہیں ہے۔(۱)

حَبِيْبَتَانِ: یہ محبوبتان کے معنی میں ہے، فعیل، مفعول کے معنی میں ہے کَلِمَتَانِ مَحْبُوْبَتَانِ: یعنی دو کلمے اللہ کو بڑے پیارے ہیں اور مطلب ہے کہ اللہ تعالی (ان دو کلموں کے) بولنے والے کو بہت ثواب دیتے ہیں، کیوں کہ یہ کلمے اللہ کے پسندیدہ ہیں اور جو اللہ کے (ان دو) محبوب (کلموں) کو اپنے اندر رکھے (یعنی ان کا ورد کرے، وہ) اس (اللہ) کے یہاں محبوب بن جائے گا، دیکھیے، قرآن میں ہے: ﴿اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ﴾ اگر تم اللہ کو محبوب رکھتے ہو تو ہمارے محبوب ﷺ سے محبت کرو، جیسے وہ ہمارے محبوب ہیں، ویسے ہی تم بھی محبت کرو گے تو تم بھی محبوب بن جاؤ گے۔ اللہ کو دونوں کلموں سے پیار ہے؛ لہذا جو ان کو کہے گا، اس سے بھی مجھے پیار ہوگا اور جس سے اللہ پیار کرے، پھر اس کے لئے ساری خدائی ہے۔

## الرَّحْمٰن کی تشریح

إِلَى الرَّحْمٰنِ: یہاں ''اِلَى اللّٰهِ'' نہیں کہا گیا؛ بلکہ ''إِلَى الرَحْمٰن'' کہا گیا ہے، جس کے معنی ہیں: یہ دو کلمہ رحمٰن کو محبوب ہیں، اور ''رَحْمٰنُ'' کے معنی ہیں: بہت بڑا

(۱) وفي قوله كلمتان إطلاق كلمة على الكلام وهو مثل كلمة الإخلاص وكلمة الشهادة. (فتح الباری ۱۳/۳ ۶۷، دار السلام، ریاض)

مہربان اور بہت بڑے مہربان کا کام ہوتا ہے، تھوڑے کام پر بہت اجر دینا، جس کا تصور بھی نہ ہو، لفظ ''اللہ'' کو چھوڑ کر لفظ ''رَحْمٰنُ'' لانے کا مقصد بھی یہی ہے، اللہ تعالی دینے پر آتے ہیں تو چھوٹی سے چھوٹی چیزوں پر جنت دے دیتے ہیں اور پکڑنے پر آتے ہیں تو بڑے بڑے عمل کے باوجود پکڑ لیتے ہیں۔

## اللہ کی داد و دہش اور پکڑ کا واقعہ

دیکھئے اللہ تعالی کی داد و دہش، ایک شخص کا حساب لے رہے ہیں کہ دنیا میں تم نے کیا کیا؟ میرے لئے کیا لائے ہو؟ کہتے ہیں: یا اللہ میں تیرے لئے توحید لایا ہوں۔ اللہ کہتے ہیں: توحید میرے لئے لائے ہو؟ دیکھو یہ توحید تو میرے لئے کام نہیں کر رہی ہے۔ (دنیا میں ایک مرتبہ انہوں نے) دودھ پیا تھا، پیٹ میں تکلیف ہوگئی تو زبان سے نکلا کہ دودھ پینے کی وجہ سے پیٹ میں درد ہوگیا، اللہ کہے گا: دودھ کے اندر بھی شان ہے کہ تمہارے اندر درد پیدا کردے؟ درد پیدا کرنے والا ایک ہے، شفا دینے والا بھی وہی ایک ہے، پھر تم کہتے ہو کہ اس دودھ پینے کی وجہ سے درد ہوا، تو تمہاری توحید کہاں باقی رہی، پھر بھی میں تم کو ایک بات کی (بناء) پر بخش رہا ہوں، کس بات پر؟ (وہ بات یہ ہے کہ) ایک سردی کی رات میں ایک بلی کا بچہ ٹھٹھر رہا تھا، تم کو اس کا ٹھٹھرنا دیکھ کر بڑا رحم اور ترس آیا اور تم نے اس کو اپنے لحاف کے نیچے رکھ لیا، بلی کا بچہ رات بھر آرام کے ساتھ سویا، صبح تم کو دعائیں دے کر چلا گیا، آج اسی بلی کے بچے کی دعاؤں کی برکت سے تم کو جنت دے رہا ہوں، بلی کے بچے کی دعائیں کام آرہی ہیں: ﴿وَتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ﴾ (النور: ۱۵) تم اس کو معمولی سمجھ رہے ہو؛ حالانکہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا ہے۔

اس لئے کہا جارہا ہے کہ کبھی چھوٹی چیز کو چھوٹا مت سمجھئے، پتہ نہیں کون ہلاکت کا سامان بن جائے اور کون کامیابی کا سامان بن جائے، وہ تو جب دینے پر آتا ہے تو اگر راستے سے کانٹا بھی ہٹادیں گے تو اس کے بدلہ میں جنت دے گا اور دینے پر آتا ہے تو

ایک پیاسے کتے کو پانی پلانے پر جنت دیدیتا ہے؛ مگر جب پکڑنے پر آتا ہے تو ایک بلی کو تڑپا تڑپا کر مارنے پر جہنم (میں ڈال) دیتا ہے، اس کا دینا بھی عجیب وغریب اور نہ دینا بھی عجیب وغریب ہے؛ اس لئے کسی چیز کو چھوٹا مت سمجھئے، نہ نیکی کو چھوٹا سمجھئے، نہ بدی کو چھوٹا سمجھئے، پتہ نہیں اللہ تعالیٰ کو کونسا کام پسند آجائے، اس کی شان تو نرالی ہے۔

## شیخ سعدیؒ کا مقولہ

شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے بادشاہوں کا مزاج بھی عجیب وغریب ہوتا ہے کہ کبھی گالی دیدیجئے تو دادودہش کرتے ہیں اور کبھی سلام کردیجئے تو گردن کٹوادیں گے، مزاج مزاج کی بات ہوتی ہے، بادشاہ ہے تو مزاج بھی شاہانہ ہوتا ہے، کس وقت کیا ذہن میں آجائے۔ اور وہ تو اَحْكَمُ الْحَاكِمِيْنَ ہے، اس کا کیا کہنا۔

كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ اِلَى الرَّحْمٰنِ: یہ جملہ کس کو پیارا ہے؟ اس کو، جو بہت دینے والا ہے، بڑا مہربان ہے، اس سے بڑا کوئی مہربان نہیں ہے، وہ جب دینے پر آئے گا تو سب کچھ دے گا، لینے والے تھک جائیں گے، دینے والا دینے میں نہیں تھکے گا، ایسی ذات کے لئے لفظ ''رَحْمٰنُ'' کیوں لایا گیا؛ اس لئے کہ شریعت کی ایک اصل ہے: ''اَجْرُكَ قَدْرَ نَصَبِكَ''، یعنی انسان کو اس عمل میں زیادہ ثواب ملتا ہے جس میں مشقت زیادہ ہوتی ہے، جس کام میں جتنی زیادہ مشقت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اس پر اتنا ہی زیادہ ثواب دیتا ہے، یہ ایک ضابطہ ہے، حدیث میں ہے: ''خَيْرُ الْعَمَلِ اَحْمَزُهَا'' (۱) بہترین عمل وہ ہے، جو مشقت آمیز ہو؛ لیکن اللہ کے لئے ضابطہ مت سمجھئے، کبھی اللہ ہلکے کام پر بہت ثواب دیتے ہیں، جیسے ''كَلِمَتَانِ حَبِيْبَتَانِ''، بالکل ہلکا کام ہے ''خَفِيْفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ'' زبان پر

---

(۱) قد ذكر صاحب البدائع في أفضلية الأشق وأنه ﷺ سئل أي الأعمال أفضل؟ فقال: أحمزها، أي أشقها على البدن ولكن قال فيه المزي هو من غرائب الأحاديث ولم يرد في شيء من الكتب الستة وهو في النهاية لابن الأثير منسوب لابن عباس بلفظ وسئل رسول الله ﷺ أي الأعمال أفضل قال أحمزها أي أقواها وأشدها كذا في المقاصد الحسنة. (حاشیہ علیٰ اعلاء السنن، ص:۵۴، باب النوافل والسنن)

بہت ہلکا پھلکا ہے، چاہے تو بچہ بھی بول دے، بڑا انسان بھی بولدے، اب (سابقہ ضابطہ بتارہا ہے کہ)''خَفِیْفَتَانِ'' کالفظ جب یہ زبان پر ہلکا ہے تو اس کا اجر بھی ہلکا ہونا چاہئے؛ لیکن فوراً کہہ دیا کہ نہیں زبان پر اگر چہ یہ (الفاظ) ہلکے ہیں؛ لیکن :ثَقِیْلَتَانِ فِی الْمِیْزَانِ: اس کا اجر بڑا بھاری ہے، تو اب یہ عجیب بات ہے، خفیف (عمل) میں ثقیل (ثواب) آگ میں پانی، کہتے ہیں اجتماع ضدین ہے؟ خفیف بھی ہے ثقیل بھی ہے، ہلکے کام پر بہت ثواب دیدیتا ہے؛ کیوں کہ اس کی شان رحمٰن ہے، رحمٰن ایسی ہی ذات کو کہا جاتا ہے، جس سے بڑا کوئی داتا ہی نہ ہو۔

بعض کتابوں میں لکھا ہے: رَحْمٰنُ، اس ذات کو کہا جاتا ہے کہ جب اس سے نہ مانگیں تو ناراض ہو اور مانگیں تو خوش ہو، جب کہ انسان کی عادت ہے کہ مانگیں تو ناراض ہوتا ہے اور نہ مانگیں تو خوش ہوتا ہے؛ لیکن اللہ تعالی کی شان بندوں سے بالکل الگ ہے، قرآن میں ہے: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِہٖ سَیَدْخُلُوْنَ جَھَنَّمَ دَاخِرِیْنَ﴾ (غافر:٦٠) یعنی جولوگ اللہ کی عبادت نہیں کرتے (اورعبادت کا مطلب ہے کہ اللہ کہتا ہے کہ) اگر تو مجھ سے نہیں مانگے گا تو ہم عنقریب ذلت کے ساتھ تجھے جہنم میں داخل کردیں گے؛ کیونکہ تم نے ہم سے مانگا ہی نہیں، دینے پر آتا ہے تو دشمنوں کو اتنا دیتا ہے کہ ہم گمان بھی نہیں کر سکتے۔

## شیطان سے سبق حاصل کیجئے

دیکھئے شیطان (کے واقعہ) سے سبق حاصل کرنا چاہیے، دھکے دیے جارہے ہیں کہ نکل جا میرے دربار سے، تو نے میرے حکم کو ٹھکرایا ہے، میں تجھے اپنے دربار سے ٹھکرارہا ہوں، شیطان ذلیل وخوار ہوکر جارہا ہے؛ لیکن کیسا ہے؟ کہ نکالا جارہا ہے پھر بھی ہاتھ پھیلا رہا ہے کہ اے اللہ نکال تو رہا ہے؛ لیکن قیامت تک کے لئے مجھے مہلت دیدیجئے کہ میں قیامت تک زندہ رہوں، اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ جو ملے گا اسی دربار سے ملے گا اور اللہ غصہ میں دیتا ہے تو خوشی میں کتنا دے گا؟ دیکھئے اللہ کی غصہ کی حالت ہے، پھر بھی

شیطان مانگ رہا ہے: قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ،،(الحجر۳۶) کسی وقت بھی انسان کو اللہ سے مانگنا نہیں چھوڑنا چاہیے؛ کیوں کہ جب اللہ تعالی اپنے سب سے بڑے دشمن کو دیتا ہے، تو مومن کو کیوں نہیں دے گا؟

شیطان یہ بھی سبق دے رہا ہے کہ کبھی مانگنا مت چھوڑیئے، دیکھئے اللہ مجھے دھکے دے رہا ہے پھر بھی میں مانگ رہا ہوں اور مجھے مل بھی رہا ہے؛ حالانکہ ملنا نہیں چاہئے تھا تو جب وہ دشمنوں کو دے رہا ہے، تو جو محبوب ہوگا اس کو کیوں نہیں دے گا؛ اس لئے دشمنوں کی اگر اچھی بات ہے تو اس کو بھی اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کیجئے، شیطان کا یہ عمل ہمارے لئے بہت قیمتی ہے کہ اللہ سے کبھی مانگنا مت چھوڑیئے، چاہے وہ غصہ ہی ہو یا رضامندی کی حالت میں ہو، ہر حال میں اسی سے مانگنا ہے؛ کیوں کہ وہ رحمٰن ہے داتا ہے۔

قیامت کے روز بھی جب ہم خدا کے پاس جائیں گے تو نبی ﷺ اس دن بھی بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہوں گے، اللہ تعالی فرمائیں گے: اِرْفَعْ رَأْسَكَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ: اے میرے محبوب سر اٹھایئے، بتایئے کیا مانگتے ہیں؟ آج جب کہ ایسا دن ہے کہ اس دن کی طرح اللہ نہ کبھی غصہ ہوا اور نہ کبھی غصہ ہوگا، پھر بھی نبی کریم ﷺ جو سب سے بڑے محبوب ہیں، وہ بھی سر جھکا کر مانگ رہے ہیں، اِدھر شیطان کا حال اور اُدھر سرور انبیا ﷺ کا حال، یہ سب شیطانوں کا سردار، وہ سب انبیاؤں کے سردار، دونوں کی باتوں کو ملائیں کہ یہاں سرور انبیا ﷺ اللہ سے مانگ رہے ہیں، اللہ تعالی دے رہا ہے۔ سب سے بڑے غصہ کے اندر شیطان مانگ رہا ہے کہ اے اللہ قیامت تک کے لئے تو مجھے زندہ رکھ دے، یہاں بھی مل رہا ہے، وہاں بھی مل رہا ہے۔

## اللہ کے خزانے میں کبھی کمی نہیں ہوتی

یہی رحمٰن کی شان ہوتی ہے، وہ کبھی بھی دینے سے باز نہیں آتا؛ کیوں باز نہیں آتا؛ کیوں کہ دینے سے اس کا کوئی نقصان نہیں ہے؛ لینے والے کا فائدہ ہی فائدہ ہے، اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آتی ہے، حدیث میں آتا ہے: اگر انسان، جنات، چرند، پرند اور جتنی

چیزیں ہیں، سب اللہ سے سوال کریں اور سب کو اللہ تعالی ان کی منہ مانگی مراد دے دے، تو بھی اس کے خزانے کے اندر اتنی بھی کمی نہیں آئے گی، جتنی سمندر کے اندر سوئی ڈال کر، نکالیں تو سمندر کے اندر کمی آتی ہے، وہ (اللہ) باقی ہے، اس کا خزانہ باقی ہے، اس کے یہاں فنا کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ہے کوئی ایسا داتا ہے؟ اس کی ذات بھی ہمارے وہم وگمان سے باہر ہے اس کی ذات ہماری عقل سے ماوراء ہے، اس کا فعل بھی ہماری عقل سے ماوراء ہے، نہ اس کی بات سمجھ میں آتی ہے، نہ اس کی دادودہش سمجھ میں آتی ہے، کسی شاعر نے کہا ہے:

تو عقل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا ☆ بس جان گیا تری پہچان یہی ہے

عقل سے تو معلوم ہے کہ اتنے بڑے عالم کا تو کوئی پیدا کرنے والا ضرور ہے؛ لیکن جب اس کی قدرت کے سمندر میں گھستے ہیں، تو کہیں لاگ پتہ نہیں کہ اس کے پاس کتنا ہے؟ اس نے کتنا دیا ہے؟ اور کتنا اس کے پاس ہے؟ ابھی زمین کو دیکھئے ہر زمانے میں ''مادرِ مشفق'' بن کر لوگوں کی غذا اور جانوروں کو چارہ فراہم کر کے، لوگوں کو سامانِ زندگی مہیا کررہی ہے؛ لیکن کیا اس زمین نے کبھی بخل کیا ہے؟ جب اللہ کی مخلوق کا یہ حال ہے! تو خالق کا کیا حال ہوگا؟

فَفِیْ کُلِّ شَیْءٍ لَهٗ اٰیَةٌ ☆ تَدُلُّ عَلٰی اَنَّهٗ وَاحِد

ہر چیز میں اس کی نشانی ہے، جو بتلا رہی ہے کہ وہ ''وحدہ لاشریک لہٗ'' ہے۔

البَعْرةُ تَدُلُّ عَلَی الْبَعِیْرِ ☆ وَالْأَقْدَامُ عَلَی الْمَسِیْرِ

وَالسَّمَاءُ ذَاتُ الْأَبْرَاجِ ☆ وَالْأَرْضُ ذَاتُ الْفِجَاجِ

فَکَیْفَ لَاتَدُلُّ عَلَی اللَّطِیْفِ الْخَبِیْرِ

موتی، موتی بنانے والے کا پتہ دیتا ہے، اتنا بڑا عالم؟ اتنا بڑا آسمان؟ اتنی بڑی زمین؟ اگر اپنے بنانے والے کا پتہ نہیں دے گی تو سمجھئے عقل اور دل پر مہر لگی ہوئی ہے، اس کے دل کے اندر کوئی ایسا راستہ نہیں کہ جو خدا کا پتہ بتا دے، وہ کتنا بڑا بدنصیب انسان ہوگا کہ وہ اپنے خالق کا بھی بڑا نمک حرام بن جائے، جو وہاں کا ٹھکرایا ہوا ہو، وہ کبھی بھی کسی درجہ کا

مقبول نہیں ہوسکتا۔

## ایک واقعہ

اس دن ذرا ذرا سی چیز ترازو کے اندر ڈالی جائے گی تو ہلکی بھاری ہوجائے گی اور بھاری ہلکی ہوجائے گی، ایک حدیث کے اندر آیا ہے: ایک انسان کا نامۂ اعمال ناپا جائے گا، ایک پلڑے میں گناہ اور ایک پلڑے میں اس کے نیکی کو رکھا جائے گا، نیکی کا پلڑا ہلکا ہوجائے گا اور بدی کا پلڑا بھاری ہوجائے گا۔ اب کیا ہوگا؟ فوراً ایک بادل آئے گا اور نیکی کے پلڑے کو جھکا دے گا اور بدی کے پلڑے کو ہلکا کردے گا دیکھئے جو بھاری تھا، اس کو ہلکا کردیا اور جو ہلکا تھا اس کو بھاری کردیا، یہ شخص پوچھے گا: یا اللہ یہ کونسی چیز تھی، جو وقت پر کام آ گئی؟ اللہ کہے گا: جانتے ہو، یہ بادل تمہارا علم ہے، تم دنیا کے اندر لوگوں کو نیکی کی باتیں بتاتے تھے، راہ راست کی باتیں بتاتے تھے یہ وہی ہے بادل کی شکل میں، یہاں پر تمہارے نیکی کے پلڑے کو جھکا دیا۔

## علماء کے قلم کی روشنائی شہیدوں کے خون سے زیادہ وزنی ہوگی

علم کی صورت سے معلوم ہوا کہ اللہ وہاں پر ہر چیز کو ایک صورت دے گا: ﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا﴾ علم بھی بادل کی شکل میں ہوگا۔ ایک حدیث میں آیا ہے: قیامت کے روز اللہ شہیدوں کا خون اور علماء کی روشنائی، جس سے انہوں نے علم کو لکھا ہوگا، دونوں کا وزن کیا جائے گا تو شہیدوں کے خون سے علماء کی روشنائی بھاری ہوجائے گی؛ کیوں کہ شہید کا تو اپنا فائدہ ہوا اور علماء کی روشنائی سے دنیا کا فائدہ ہوا، شہید کا فائدہ لازم ہے اور علماء کا فائدہ متعدی؛ غرض یہ کہ ہر چیز کی وہاں ایک صورت ہوگی، اللہ تعالی کس کام کے بدلے ہماری نجات دے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

## سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ، سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ

یہی بخاری کا آخری جز ہے، جس میں کہا گیا کہ اللہ کی تعریف کرو؛ اس لئے نہیں

کہ وہ دیتا ہے؛ بلکہ اس لئے کہ تعریف کے لائق اسی کی ذات ہے؛ اگر وہ نہ بھی دے، تب بھی اس کی ذات قابل تعریف ہے، وہ دینے کی وجہ سے قابل تعریف نہیں ہے، وہ اپنی ذات کے اعتبار سے قابل تعریف ہے۔ اب بتلایئے اگر وہ تم کو دیدے تو کس قدر تعریف کے لائق ہے! یہی حمد کا مطلب ہے اور حمد اور مدح میں یہی فرق ہے، ایک نعمت کے بدلے ہوگا اور دوسرا نعمت اور غیر نعمت دونوں کے بدلے، یہی دوسرا حمد ہے، نہ دے تو بھی قابل تعریف ہے، سب چیز کا مرکز اور ہر چیز کا مرجع ومحور تو وہی ہے، سب چیزیں لوٹ کر وہیں جانے والی ہیں۔

سوچئے ! اگر وہ نہ دے تو بھی قابل تعریف ہے اور دیدے تو کتنا قابل تعریف ہوگا؟ اللہ ایسی چیزیں ہمیں دے رہا ہے کہ اگر ان میں سے معمولی چیز نہ دیتا تو دنیا کی کوئی طاقت ہم کو نہ دے سکتی، ایک بال نہ دیتا تو پھر دنیا کی تمام چیزیں خرچ کر دیتے، تب بھی وہ چیز نہیں ملتی، جو پیدائشی گنجا ہے، گنجا ہی رہے گا، وہ بال والا نہیں ہوسکتا، جو پیدائشی نابینا ہے، اس کو آنکھ نہیں مل سکتی، چاہے تم پوری دنیا خرچ کر دو، سر سے پیر تک دیکھئے اللہ کی کتنی نعمتوں سے ہم گھرے ہوئے ہیں اور ہر نعمت انمول ہے، وہ بھی بغیر عوض کے مفت دے رہا ہے۔

## اللہ کی بے شمار اور حیرت انگیز نعمتیں

اللہ کی نعمت پر اب دھیان دو، اگر یہ ہوا رک جائے ،تو منٹ بھر میں دنیا ختم ہو جائے گی، کوئی ہے اللہ کی نعمت پر شکریہ ادا کرنے والا؟ کسی کا ذہن بھی اس طرف نہیں جاتا ہے اور دیکھئے اللہ کی نعمت ہمیں رات میں نیند آسانی سے آجاتی ہے، جسے نیند نہیں آتی، ان سے پوچھئے ان کے لئے مصیبت بنتی ہے، بہترین چارپائی ہے بہترین گدے ہیں اور بہترین تکیے ہیں؛ اگر نیند نہ آئے تو وہی بہترین گدے اور تکیے اس کے لئے کانٹے بن جاتے ہیں، ہر منٹ پر وہ تارے گنتے ہیں، کھڑے ہوتے ہیں، بلکتے ہیں کہ نیند نہیں آرہی ہے، اب ہمیں نیند آجاتی ہے بغیر پیسے کے، اللہ دے رہا ہے، ہمیں اس کی قدر نہیں؛ بلکہ

جنہیں نیند نہیں آرہی ہے، ان سے نیند کے بارے میں پوچھئے ،ایسے بھی اللہ کے بندے ہیں کہ ٹیبلیٹ کھانے کے بعد بھی نیند نہیں آتی ، میں نے بھی سنا ہے کہ دو، دو مہینے اور تین تین مہینے تک نیند نہیں آتی ہے، ایسا آدمی پاگل نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا، یہ اللہ کی انمول دولت ہے،اور اللہ کی نعمت کیا ہے؟ یہ سورج بے کار تمہارے لئے نکل رہا ہے، اگر ایک مہینہ سورج نہ نکلے تو ہمارا کیا حال ہوجائے گا اور اللہ کی نعمت کیا ہے کہ اللہ ہمارے حلق کے نیچے دانے کو اتار دیتا ہے، یہ کیا ہے، زندگی کا سامان ہے،تو یہ انسان کے لئے موت کا سامان بھی ہے؛ کیونکہ اللہ نے ہمارے حلق کے پاس دو راستے رکھے ہیں: ایک سانس کا راستہ اور دوسرا حلق کا راستہ، یہ دونوں ساتھ ملے ہوئے ہیں اگر کھانا حلق کے بجائے سانس کے راستے میں چلا جائے تو وہ بھی انسان کے لئے موت کا سامان بن جائے ؛لیکن اللہ کی رحمت ہے کہ جب انسان کھانا کھاتا ہے تو حلق کے نیچے اتارتے ہیں اور قدرتی طور پر سانس کا راستہ بند ہوجاتا ہے، صرف کھانے کا راستہ کھلا رہتا ہے، ہمیں تو پتہ بھی نہیں چلتا ہے، ہمیں تو اتنا بھی نہیں معلوم ہے کہ کس طرف کھانے کا راستہ ہے اور کس طرف سانس لینے کا راستہ ہے، یہ سب کرنے والا کون ہے جو یہ سب کر رہا ہے۔

## حکیم الامتؒ کا ارشاد

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا: لوگ سمجھتے ہیں کہ غذا ہماری زندگی کا سامان ہے؛لیکن اگر اللہ چاہے تو اسی کو موت کا سامان بنادے، یہی تمہارے لئے بندوق کی گولی ہے، اگر اِدھر کے بجائے اُدھر ہوجائے ، تو وہی تمہاری موت کا سامان بنے گا، اور اگر ہمیں معلوم بھی ہوجائے کہ کونسی سانس کی نالی ہے اور کونسی کھانے کی تو یہ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، انہیں کیا معلوم ہے؟ کہ کدھر دودھ کی نالی ہے اور کدھر سانس کی نالی ہے؛ سب کچھ اللہ کرتا ہے۔ صحیح کہا ہے کہ اللہ اگر دینے پر آتا ہے تو موت کی چیز کو زندگی کا سامان بنادیتا ہے اور گناہوں کو نیکی بنا کر ثواب دیدیتے ہیں: ﴿اُولٰئِكَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ

سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنَاتٍ﴾ (الفرقان:۷۰) ایسا داتا ہے کہ برے کو نیک بنا کر ثواب دینے لگتا ہے اور ایسا داتا کہ بندوق کی گولی کو زندگی کا سامان بنا دیتا ہے۔

اتنی دولت وہ دے رہا ہے اور ہر آن دے رہا ہے، ہر گھڑی دے رہا ہے؛ لیکن آج کون ہے، جو اللہ کا شکر ادا کرنے والا ہو؟ آج تو حالت یہ ہے کہ بہت بڑی دولت کا مالک ہے، نیند سے اٹھتا ہے، تو فوراً اخبار کی تلاوت شروع کر دیتا ہے، جس میں ننگی ننگی تصویریں ہوتی ہیں، کبھی اللہ کا شکر ادا کیا ہے؟ اور سو کر اٹھنے کی یہ دعا پڑھی ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَحْيَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ. کچھ نہیں، اٹھا اور اٹھنے کے بعد اخبار کی تلاوت شروع کر دی، کسی کے پاس ٹی۔وی ہے تو جا کر آرام سے دیکھ رہا ہے، اٹھنے کے بعد کام کی بات کرنے کے لئے ٹیلیفون چالو کر دیا کہ آج کس بات پر تبصرہ ہو رہا ہے، موبائیل کا تبصرہ، آج موبائیل کے گیت گائے جاتے ہیں۔

آخر میں امام بخاریؒ بھی کہتے جا رہے ہیں کہ دیکھو سب کو بھول جانا؛ لیکن اللہ کی حمد کو مت بھولنا، اللہ کی تعریف کو مت بھولنا، اللہ کی عظمت کو مت بھولنا، سب چیز کو بھول جاؤ اور سب چیز ہاتھ سے نکل جائے تو کوئی بات نہیں؛ مگر خدا تمہارے دل سے نہیں نکلنا چاہئے۔

## حدیث کی ترجمۃ الباب سے مطابقت

یہ امام بخاری نے جو ترجمۃ الباب قائم کیا ہے، یعنی: (وَاَنَّ اَعْمَالَ بَنِيْ اٰدَمَ وَقَوْلُهُمْ تُوْزَنُ) اسے حدیث سے ثابت کر رہے ہیں اور وہ ہے: ثَقِيْلَتَانِ فِي الْمِيْزَانِ یہی ترجمۃ الباب کے مطابق ہے۔(۱)

اخیر میں باری تعالیٰ کے حضور سر بسجود ہوں کہ اللہ تعالیٰ صدق دل سے ہر نعمت کی قدر کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین ثم آمین)

---

(۱) وقوله ثقيلتان في الميزان وموضع الترجمة لأنه مطابق لقوله وأن أعمال بني آدم توزن. (فتح الباری ۶۷۳/۱۳، دارالسلام، ریاض)